سلونی

سلونی

قُربِ عباس

سانجھ

لفظ لفظ اپنے
والدین اور محترم
استاد منظور قریشی
کے نام
جن سے میں نے
بولنا، سوچنا اور لکھنا سیکھا

محبت زندگی کا جشن ہے.جی بھر کے مناؤ......

فہرست

افسانے

مختصر مختصر

تاثرات

مَیں، میری کہانیاں اور آپ

افسانہ 'سلونی' کے بارے کہا گیا کہ عورت کو جانور کے ساتھ تشبیہ دینا عورت کی بے حرمتی ہے۔

خوش آئند بات ہے کہ ہمارا سماجی شعور عورت کی حرمت کا قائل تو ہوا۔ افسانے کی ''سلونی'' مجھے اس لیے عزیز ہے کہ بے زبان ہو کر بھی وہ اپنی آزادی کے لیے آواز بلند کر رہی ہے۔ اپنا لکھا یہ افسانہ کئی مرتبہ میری نظر سے گزرا...... ہر بار یہ تصور مضبوط تر ہوا کہ وفا شعاری، فریضۂ پاسبانی، اور حق آزادی کی پاسداری میں یہ جانور انسان سے کہیں زیادہ با کردار ہے۔ یوں میری کتاب نے سلونی کو اپنا عنوان منتخب کر لیا۔

جھوٹ فریب دھوکہ جیسے الفاظ لغت میں خود انسان نے درج کیے ہیں اور خود ہی ان کا مرتکب ہوتا ہے، جانوروں کو تو ان صفات عالیہ کا علم ہی نہیں۔ کمیشن، کرپشن اور اسمبلی عدالت بھی خود بناتا ہے اور قتل قانون شکنی بھی خود کرتا ہے۔ اگر جانوروں کی اپنی زبان، اپنی پارلیمنٹ اور اپنا آئین ہوتا تو کسی جانور کو ''انسان کا بچہ کہنا'' نا قابل ضمانت جرم ہوتا۔

میں نہیں جانتا کہ مجھے اپنی اس کتاب کے بارے مزید کیا کہنا چاہیے۔ یہ کتاب میرے اور میرے ارد گرد کے ماحول کا ایک مختصر مگر رواں سیر بین ضرور ہے جس کے کردار زندہ قالب میں ڈھل کر آپ سے ہم کلام ہوں گے۔ آپ ایک ایسے انسان سے ملاقات کرنے جا رہے ہیں جو مسلسل وحشت ناک حقیقتوں سے الجھ رہا ہے۔ بربریت، قتال اور گھٹن کی اس زمین سے اٹھنے والی دلدوز چیخیں ہر لمحہ اس کے تعاقب میں ہیں۔ ہوسکتا ہے ہر سطر میں یہ مہیب شور آپ کو بھی سنائی دے۔

درحقیقت ذہن میں پیدا ہونے والا ''کیوں'' میری ہر کہانی کا باپ ہوتا ہے۔ یہ کڑوا

' کیوں ' جب دل میں اترتے ہی دیواروں کو کریدنے لگتا ہے تو کاغذ کی سی باریک پرت رہ جاتی ہے۔اس سے پہلے کہ یہ پورے وجود میں زہر کی طرح پھیل جائے میں کہانی تجسیم کر کے آپ کے سامنے رکھ دیتا ہوں تو کچھ سکون سامل جاتا ہے......مگر......صرف اگلے ' کیوں ' کے ذہن میں اتر جانے سے پہلے تک......

لیکن سوال تو یہ ہے کہ کیا لکھ دینے کے بعد یہ کہانیاں فنا ہو جاتی ہیں......؟ شاید نہیں......اسی طرح اپنی حقیقت کی دہلیز پر بیٹھی سسکتی رہتی ہیں، سلگتی رہتی ہیں، اندر ہی اندر کئی بستیاں بسا لیتی ہیں۔ بالکل ایسی ہی بستیاں جو باہر کہیں ویرانوں میں، رات کی خاموش گلیوں میں......کئی مقتل گاہوں میں......کئی گریہ خانوں میں ہوا کرتی ہیں۔ یہ دن بدن پھیلتی چلی جاتی ہیں...... بڑھتی چلی جاتی ہیں...... ذرے ذرے میں سمو جاتی ہیں......بلکہ میں تو کہوں گا کہ کائنات میں موجود ہر زندگی الجھی کہانیوں کا پھندنا ہے......یعنی ماں کی کوکھ میں قطرے سے گوشت کے لوتھڑے میں تبدیل ہونا ہماری پہلی کہانی اور سانس کا ٹوٹ جانا آخری کہانی......اس عرصے کے دوران میں ہم کئی کہانیاں بُننے کے ساتھ ساتھ دوسروں کی کہانیوں میں کردار بھی نبھاتے ہیں، یہ کردار کبھی مرکزی ہوتے ہیں تو کبھی ثانوی......سو ہر طرف کہانیاں ہی کہانیاں ہیں، کردار ہی کردار ہیں......میرے اردگرد میرے اندر......آپ کے سامنے آپ کے اندر......کم از کم مجھے تو ہر سمت دکھائی دیتے ہیں...... چلتے پھرتے، کھاتے پیتے، اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے کنپٹی میں درد کی طرح افسانے دُکھتے رہتے ہیں...... ان کرداروں سے دوستی سی محسوس ہوتی ہے......کچھ محبت سی......اپنائیت سی......کبھی کبھی ہمدری بھی اور نفرت کے ساتھ غصہ بھی، یہ جاننے کے باوجود کہ بے چارہ کردار تو محض ایک کردار ہے......معاشرے کے سانچے میں ڈھلا ہوا کردار...... ماحول کے دھاگوں کے ساتھ بندھا اشاروں پر ناچتا، آنکھیں مٹکاتا، کمر لہراتا، گردن کو جھٹکاتا......ہنستا روتا گاتا کردار......جھوٹ سچ، نیکی بدی، بُرائی اچھائی کے ترازو میں تولا ہوا کردار......کردار تو محض کردار ہے......اور کیا ہے؟ کچھ بھی نہیں......

کم از کم مجھے تو ہر محفل میں قدم رکھتے ہی محسوس ہوتا ہے کہ یہاں پرانہی کرداروں سے مل کر کوئی کہانی کشید کرنے آیا ہوں......اوور ہیڈ برج سے گزرتے ہوئے نیچے دیکھوں تو ساکت اور کبھی تیز رفتار......دوڑتی چیختی چلاتی روشنیوں کے آس پاس کہانیاں رینگتی دِکھائی دیتی ہیں،

انڈر پاس کے اندھیرے میں یہی بے شکل سے کردار نظر آتے ہیں......گندا اور ٹھہرا ہوا پانی ایک فکر انگیز موضوع لگتا ہے......کہانیاں ہی کہانیاں ہیں، کردار ہی کردار ہیں اور سب ہی کہانی کار ہیں......نجانے ہم پھر کس لیے کہتے ہیں کہ کہانیاں نہیں ملتیں......ایسی ہی کچھ کہانیاں ایک جگہ بیٹھی کہہ رہی تھیں؛

''ہمیں کہانی گو نہیں ملتے......''

میں ان کا ہاتھ تھام کر اپنے ساتھ لے آیا......اب آپ کے ہاتھ میں ہیں۔

قُربِ عبّاس

لاہور، پاکستان

13 جون، 2015

qurbabbas@gmail.com

داؤجینز کا چراغ

(Diogenes of Sinope)

شوپنہار ایک ہوٹل (Englishchorhof) میں کھانا کھاتا تھا۔ جب وہ کھانا شروع کرتا تو میز پر سونے کا ایک سکہ رکھ لیتا اور فارغ ہونے پر واپس جیب میں ڈال لیتا۔ آخر ایک waiter نے جھنجھلا کر اس رسم کی وجہ پوچھ ڈالی۔ شوپنہار نے جواب میں کہا میں روز خود سے شرط لگا کر بیٹھتا ہوں کہ جس دن یہ ادیب رومانوی ادب، ثقافتی نرگسیت اور قومی تفاخر سے ہٹ کر کسی نئے موضوع پر گفتگو کریں گے تو میں یہ سکہ خیرات کر دوں گا۔

برٹرینڈ رسل نے رومانوی ادب پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا:

خارجی تجربے سے گریز کر کے داخلی تجربے پر توجہ مرکوز کرنا رومانیت ہے جو؛

سیاسیات میں استبدا

عمرانیات میں فردیت

فلسفے میں خرد دشمنی

اور اخلاق میں انانیت کی پرورش کرتی ہے۔

وہ ادیب کبھی نہیں مرتا جس کے پاؤں زمین کو چھوتے رہتے ہیں۔ عمروں کو برسوں میں نہیں ماپنا چاہیے، عمر اُن کی زیادہ ہوتی ہے جو تخلیقی کام زیادہ کرتے ہیں۔ ان لوگوں کے بارے سوچیں جو دفن ہونے سے پہلے ہی مر جاتے ہیں، اور ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو دفن ہونے کے بعد بھی نہیں مرتے۔ کلاسیکی ادب انہی زمین دوست ادیبوں کی داستان ہے اور قُربِ عباس اس داستانِ جرأت و جراحت کا تسلسل ہے۔

2008 کے آس پاس فیس بک پر مجھے قربِ عباس کی Add Request ملی، اطمینان کر لینے کے بعد کہ میں fake نہیں ہوں کچھ دنوں بعد اس کی ای میل آئی:

''سر جی ایک درخواست ہے۔ فرصت ملے تو اس کہانی کو ایک نظر دیکھ لیجئے گا، لکھنے لکھانے میں دلچسپی رکھتا ہوں۔ انتظار کروں گا۔''

کہانی میں محبت اور رومانس کا ذکر کہیں نہ تھا، مناظر حاشیہ آرائی نہ تھی، جھوٹا سچا افسانہ بھی نہ تھا۔ زندگی تھی اور اس کے اندر کروٹیں لیتی مضطرب فکر۔ میں نے پکڑ لیا اور ہتھکڑی لگا دی۔ خوف تھا کہ یہ زرخیز ذہن فرشتوں کے ہاتھ لگا تو اوپر پہنچا دیا جائیگا۔ میں فکشن کا آدمی نہیں ہوں پر ای میل پر وہ کہانیاں بھیجتا رہا اور ہمارے ڈسکشن جاری رہی۔ کہانیوں کو واضح فکری سمت ملتی گئی۔

کچھ سال بعد قُربِ عباس اسلام آباد سے لاہور ٹرانسفر ہوا تو میرے حجرے میں گھس آیا، بالمشافہ یہ ہماری پہلی ملاقات تھی۔ میں نے ہتھکڑی کھول دی۔ ڈھابے پر جا بیٹھے، چائے اور سگریٹ کی تمازت میں آنے والا کل اس کی بیدار صلاحیتوں کو کامیاب افسانہ نگار کی بشارت دے رہا تھا۔

کہانیاں اسے سوچنی نہیں پڑتیں، کہانیاں انتظار میں رہتی ہیں کہ کب اس کو فرصت ملے اور کب وہ ہمیں لکھے۔ اس کے نزدیک کاغذ پر قلم رکھنے اور اٹھانے کے درمیان کا وقفہ اس کی کہانی ہوتا ہے۔ اس کا خیال ہے رائیٹر وہ نہ لکھے جو ہم سب لکھ سکتے ہیں، بلکہ وہ لکھے جو ہم سب نہیں لکھ پاتے۔ انسان کو نفسیات کا گورکھ دھندا مانتا ہے اور اس کا مطالعہ کرنا اس کو سمجھنا اس کا پسندیدہ مضمون ہے۔

قُربِ عباس کے جوہرِ تخلیق میں افسانہ نگار اور نفسیات داں دونوں جڑواں وجود میں آئے تھے، ایک کی عدم موجودگی دوسرے کی موت ہوتی۔ اس کا زیرک ذہن اور قوت مشاہدہ کسی طلسماتی ہیولے کی طرح اس کی نظر کے ساتھ سفر کرتا ہے۔ کوئی معمولی سا واقعہ، بے توقیر سا لمحہ، بے نام سا جذبہ اس کی حس تجسس کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور پھر وہ زندگی کے نہاں خانوں میں کسی لطیف جھونکے کی طرح نہایت آہستگی سے اتر جاتا ہے۔ گرد آلود بوسیدہ پرتوں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھتا ہے۔ سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور کچھ سمجھ نہ آئے تو سوال اٹھاتا ہے۔ یہی سوال اس کے افسانے کہلاتے ہیں۔

صاحب علم دوستوں نے قرب عباس کے فن افسانہ نگاری، تخلیقی ہنر، نفسیاتی پرکاری، اور کرافٹ سازی کا فرداً فرداً انتہائی تفصیل سے جائزہ لیا ہے، میرا ان نکات پر پھر سے تبصرہ کرنا غیر ضروری اعادہ ہوگا جو مواد میں کوئی بامعنی اضافہ نہ کر پائے گا۔

جیسا کہ ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے پارسا ناقدین کی طرف سے تنقید آئے گی، سیاق و سباق سے علیحدہ کہ من پسند جملوں کو اچک کر خوردبین سے عریاں نگاری کے جرثوموں کو تلاش کیا جائے گا۔ مگر جو نظر نہیں آئے گا وہ ہر کہانی میں ابلتے درد اور اٹھائے گئے سلگتے سوال ہوں گے جن کا سامنا ان کرداروں کو رہا۔

عالمی افسانہ فورم پر نوجوان اذہان کو پڑھنے کا موقع ملا، مرد و خواتین بڑی جرأت سے نئے سوال اٹھا رہے ہیں۔ طلاق کے ایک مقدمے میں خاتون جج مرد وکیل سے استفسار کر رہی ہے؛

''اگر تمہارے مؤکل کی بیوی شادی کے وقت کنواری نہ تھی تو تم یہ کیسے ثابت کرو گے کہ اس کا دولھا شادی کے وقت کنوارا تھا بدکار نہ تھا؟''

مجھے فرصت بہت کم مل پاتی اور جب کئی ہفتوں بعد وقت ملتا تو حجرے میں ای میل سے وصول شدہ افسانوں پر قرب عباس سے گفتگو اگلی صبح ناشتے تک چلتی ہے۔ کرداروں کے دکھ اور موضوعات کی نفسیاتی باریکیوں کو کھنگالتے وقت مجھے داؤجینز اور قرب عباس کی فکری افتاد میں حیران کن مماثلت نظر آئی۔

داؤجینز اور افلاطون سقراط کے شاگرد تھے مگر داؤجینز افلاطون کے تصورِ الہیات، کہ ہماری دنیا آسمانوں پر قائم ابدی دنیا کا عکس ہے، سے اختلاف رکھتا تھا۔ وہ کہتا افلاطون جب تمہاری ہڈیاں گل سڑ جائیں گی تو مجھے تمہاری اور کسی غلام کی ہڈیوں میں فرق کرنے میں دقت ہوگی۔ ایک دن افلاطون ''آدمی'' کی definition بتا رہا تھا کہ؛

''بغیر پروں کے دو ٹانگوں پر چلنے والا جانور آدمی کہلاتا ہے۔'' داؤجینز نے گلی سے مرغا پکڑ کر اس کے بال و پر نوچے اور کلاس میں لا کھڑا کیا۔ افلاطون نے پوچھا یہ کیا ہے؟ داؤدجینز نے کہا:

''آپ کا آدمی......''

قزاقوں نے داؤجینز کو اغوا کر کے غلام بنالیا۔ تاجر نے قیمت پوچھی تو داؤجینز نے قزاق

سے کہا مجھے اس کے ہاتھ بیچ دو اسے آقا کی ضرورت ہے۔تاجر نے خرید کر داؤجینز کو اپنے بچوں کا استاد مقرر کر دیا۔ادب میں قواعد دانوں (grammarians) کے بارے اس کا کہنا تھا کہ یہ بیچارے پتیوں کے ڈیزائن پر عمر صرف کر دیتے ہیں اورنہیں جانتے کہ ڈیزائن سے زیادہ پھول اپنی مہک سے پہچانا جاتا ہے۔ ایک دن ایک گڈریے نے لڑکے کو ہاتھ کی اوک بنا کر پانی پیتے دیکھا تو اپنا پیالہ پھینک دیا اور کہا:

''افعال جو فطرت سے ہم آہنگ ہوں وہ غیر اخلاقی یا گناہ کبھی نہیں ہو سکتے۔''

خود کو ایتھنز کے بجائے عالمی ریاست کا شہری مانتا تھا۔دن کے وقت ہاتھ میں روشن چراغ لے کر ایتھنز کی گلیوں میں نکلتا۔دیکھنے والے اسے سنکی (cynic) کہتے۔بھلا دن کی روشنی میں چراغ کا کیا کام؟داؤجینز کا کہنا تھا؛

''روشنی کہاں ہے ہر طرف تو اندھیرا ہے۔''

وطنِ عزیز کی گلیاں ہیں جہاں دن کے وقت بھی اندھیرا ہے،مگر قربِ عباس کی بغل میں کچھ کہانیاں اور ہاتھ میں داؤجینز کا چراغ ہے۔

قُربِ عباس اور نئی نسل کا سواگت!

قریشی منظور

بھکر

جون2015

qmsayitnow@gmail.com

ہوسٹس

آتی جاتی گاڑیوں کے شور، ملتے بچھڑتے مسافروں کی دعائیں اور لاتعداد انسانوں کی بھنبھناہٹ نے لاری اڈے کی رات کو دن میں بدل دیا تھا۔ انسانوں کے اس بے ہنگم ہجوم میں کاندھے پر بیگ لٹکائے میں بھی ٹکٹ کاؤنٹر سے فارغ ہو کر بس کے اسلام آباد نکلنے کا منتظر تھا۔ جس بس کا ٹکٹ میری جیب میں تھا وہ میرے سامنے کھڑی تھی، دیگر سواریاں بھی سامان لیے ارد گرد جمع ہو رہی تھیں۔ ہوسٹس اور ڈرائیور کمپنی یونیفارم میں آتے دکھائی دیئے۔ ہوسٹس کی آنکھوں میں حیا اور چہرے پر خلوص تھا، وہ ڈرائیور کے ساتھ مسکرا کر کوئی بات کرتے ہوئے بس کی جانب بڑھ رہی تھی۔ اس کے وجود میں کچھ ایسی کشش تھی کہ جس نے میری نظروں کو اپنے ساتھ باندھ لیا۔ مجھے اس کی مسکان بے حد اچھی لگ رہی تھی۔

گیٹ کھلنے کے بعد عملے نے اسے کچھ سامان دیا جو سفر کے دوران استعمال ہونا تھا۔ سامان رکھ کر وہ گیٹ کے اندر کھڑی ہوگئی اور سوار ہونے والوں کے فرداً فرداً ٹکٹ چیک کرنے لگی۔ بس کے دروازے والی سائیڈ پر ایک کھسکتی سی قطار بن گئی۔ جلدی میں ایک جوڑا مجھ سے پہلے قطار میں گھس گیا۔ ایک خاتون تھیں اور آگے شاید ان کا شوہر تین چار برس کے سوتے بچے کو کاندھے سے لگائے ہوئے تھا۔ میری نظر ادھر اُدھر گھوم کر دوبارہ اس ہوسٹس کی مسکان دیکھنے کو اس کے چہرے پر پلٹ آئی۔ جیسے ہی کاندھے پر بچے کو سلائے وہ شخص ہوسٹس کے سامنے آیا، تو وہ مسکان میرے دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہوگئی۔

''یہ کیا تھا......؟'' میرے ذہن نے فوراً اس ردِعمل کو پکڑ لیا۔ کچھ عجیب سا لگا، جیسے وہ اس شخص کو جانتی ہو اور دیکھتے ہی اس کے گنبدِ یادداشت میں بیک وقت پہچان کی کوئی اذان گونجی ہو۔

''ان دونوں کے بیچ کیا ہے......؟'' میرے اندر ایک تجسّس نے جنم لیا۔
مسافر اب بس میں سوار ہو چکے تھے۔ میرے ساتھ والی سیٹ پر ایک چھچھورا سا لڑکا آ بیٹھا۔ پیچھے دو عمر رسیدہ خواتین، آ گے ایک نک چڑھی عورت اور ساتھ اس کا بچہ اور میرے دائیں جانب برابر کی سیٹ پر وہی شخص گود میں سویا ہوا بچہ لٹائے اپنی بیوی کے ساتھ سپاٹ چہرہ لئے بیٹھا تھا۔ میں نے بار ہا ہوسٹس کے چہرے پر اس مسکان کو کھوجنا چاہا جو اچانک اس شخص کو دیکھتے ہی گم ہوگئی تھی۔ میرے ذہن میں کہانیاں کروٹیں لینے لگیں۔
''ہو نہ ہو...... یہ ہوسٹس کا کوئی جاننے والا ہے۔ یا ہوسکتا ہے کسی گزشتہ سفر کے دوران ان دونوں میں کوئی بدمزگی ہوگئی ہو، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس شخص نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ ایسی حرکت کی ہو جو ہوسٹس کو بری لگی ہو۔ کچھ بھی تھا مگر تھا ضرور......'' اس طرح کے خیالات ایک ایک کر کے میرے ذہن کی سیڑھیوں پر اوپر نیچے دوڑنے لگے۔
میری نظر ایک بار پھر دائیں طرف بچہ گود میں لئے شخص کی طرف گئی، عمر یہی کوئی تیس بتیس کی رہی ہوگی، قد کاٹھ بھی درست تھا، شکل وصورت بھی مناسب تھی، لباس میں سلجھاؤ تھا۔ میرے اندر بے چینی بڑھ رہی تھی، حالانکہ ان دونوں کے درمیان کچھ بھی رہا ہو یہ ان کا ذاتی معاملہ تھا۔ ظاہر سی بات ہے مجھے بھی ان کے ذاتی معاملات سے کچھ لینا دینا نہ تھا، مجھے تو صرف اس مسکان کے یُوں اچانک غائب ہو جانے میں دلچسپی تھی۔ سو میرے اندر جواز بے جواز تجسس کے کئی نیون سائن بڑی تیزی سے جل بجھ رہے تھے۔ اتنے میں میرے پیچھے بیٹھی خواتین کے درمیان ساس بہو کا سوپ سیریل شروع ہو چکا تھا۔
''پال پوس کر بڑا کیا، بیاہ کر دیا۔ اب کبھی اس نے پلٹ کر خبر نہیں لی۔ لوگ بہو گھر میں لاتے ہیں سُکھ دیکھنے کے لیے، میں نے تو اپنا بیٹا کھو دیا۔''
دوسری بولی ''میرے والے کا بھی یہی حال ہے۔ دو دو دن شکل نظر نہیں آتی، کوئی بات کرلو تو ہوں ہاں میں جواب دیتا ہے، غصہ ناک پر دھرا رہتا ہے، کوئی اس کی ملکہ کے بارے میں بات تو کر کے دکھائے۔''
میں مسکرا دیا اور اپنی جیب میں سے موبائل نکال کر وقت دیکھا بارہ بجنے میں ابھی پانچ منٹ باقی تھے۔

''ایکسکیوزمی میڈم'' ہوسٹس مجھ سے اگلی سیٹ پر بیٹھی خاتون سے مخاطب تھی۔
''آپ بچے کو گود میں کر لیجیے، ساتھ والی سیٹ فری نہیں ہے۔''
''فری نہیں ہے؟ پیچھے اتنی سیٹیں پڑی ہیں، سواری وہاں بیٹھ سکتی ہے۔'' عورت کی آواز بلند ہوئی۔
''میڈم آپ پیسنجر سے بات کر لیجیے گا اگر انھیں اعتراض نہ ہو تو آپ یہ سیٹ استعمال کر سکتی ہیں، مجھے پرمشن دینے کا اختیار نہیں۔ ویری سوری۔'' ہوسٹس نے بہت نرم لہجے میں کہا۔
''پرمشن......؟ تم کون ہوتی ہو پرمشن دینے والی؟ اور بات کرنے کی تمیز بھی نہیں؟ پیسنجر سے ایسے بات کی جاتی ہے؟'' اس خاتون نے سوچے سمجھے بغیر آسمان سر پر اٹھالیا اور ہوسٹس پر چڑھائی کر دی۔
وہ مسلسل غیر مہذب لہجے میں بولے جا رہی تھی اور ہوسٹس خاموش کھڑی اس کی باتیں سن رہی تھی۔ کچھ دیر بعد نظر انداز کئے جانے پر خاتون خاموش ہو گئی۔ اس چپقلش کے دوران میں ہوسٹس نے دو تین بار دائیں جانب والے شخص کی طرف کن اکھیوں سے دیکھا جو آنکھیں بند کیے اپنی سیٹ پر نیم دراز تھا۔ دلوں میں کیا چل رہا تھا کچھ نہیں معلوم، دلوں کی دنیا سے بے نیاز بس 110 کی رفتار سے اپنے سفر کی منازل طے کر رہی تھی۔
''ہوسٹس نے اپنی بے عزتی کے دوران اس شخص کو کیوں دیکھا اور پھر ایسے کیوں دیکھا؟ کوئی تو بات ہے۔'' میرے خیالات کی ٹرین نے ایک وسل بجایا۔
''ہوسکتا ہے یہ اس کا کوئی جاننے والا ہو؟ نہیں! جاننے والا ہوتا تو سلام دعا ہو جاتی یا پھر کوئی گلی محلے سے ہوگا؟ عورت کا غیروں کو 'سرو' کرنا، جی حضوریاں کرنا، ایک شہر سے دوسرے شہر جانا۔ وہ بھی اجنبی لوگوں کے درمیان، رات دن کا خیال کیے بغیر، اکثر کو معیوب لگتا ہے۔ سماج بھوک کو نہیں سمجھتا، افلاس کو نہیں سمجھتا، وہ نہیں جانتا کہ ایک طوائف ہے تو کیوں ہے، بس وہ ہے اور دنیا کی ایک غلاظت ہے۔ کوئی چور ہے تو کیوں ہے۔ ہوسٹس ہونے کو بھی اچھا نہیں سمجھا جاتا، عزت داروں کو اپنی بیٹیاں اس طرف بھیجتے احساسِ ندامت آ گھیرتا ہے۔ اور جو کسی مجبوری کے تحت اجازت دے دیتے ہیں وہ اپنی ہی نظر میں خود کو شرمندہ محسوس کرتے ہیں۔ شاید کچھ ایسا ہی معاملہ رہا ہوگا۔''

میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ پیچھے بیٹھی خواتین میں سے ایک اپنے ساتھ والی سے دوبارہ باتیں کرنے لگی۔ نجانے کیا ہوگیا ہے۔ کبھی پلٹ کر نہیں دیکھا، وہ تو اپنے باپ کے ہارٹ اٹیک کا سن کر بھی نہیں آیا۔ ایک فون ہی کر لیتا تو دل کو تھوڑی تسلی مل جاتی۔ اس خاتون کی آواز گھٹ گئی۔ دوسری جو اس کے ساتھ بیٹھی تھیں، اس نے حوصلہ دیا۔ ''تو یوں ہی رو رو کر پاگل ہو جائے گی۔ اس کو تو ذرہ برابر پرواہ نہیں۔''

''نہ ہو پرواہ مگر میں تو ماں ہوں میرا کلیجہ تو پھٹتا ہی ہے۔ مہینوں سے اپنے بیٹے کا چہرہ نہیں دیکھا۔'' اس نے روتے ہوئے جواب دیا۔

میں نے اس عورت کے لہجے کا کرب محسوس کیا اور میری سوچ کا رخ اس بار رشتوں کی طرف مڑ گیا۔

''ہم رشتوں کو کیسے گنوا دیتے ہیں؟'' میں نے سوچا۔ ''حالانکہ یہ تو ہماری پوری زندگی کا حاصل ہوتے ہیں۔ تمام عمر کبھی انا تو کبھی کسی چیز کے نشے میں ہم یہاں وہاں بھٹکتے رہتے ہیں۔ مگر میں نے دیکھا ہے کہ ایک وقت ایسا آتا ہے جب آنکھیں صرف اور صرف اپنوں کو تلاش کر رہی ہوتی ہیں۔''

میرے خیالات ٹرین کے ڈبوں کی طرح آپس میں جڑ جڑ کر تیار کھڑے تھے، کس سمت جانا تھا کچھ طے نہیں ہو پا رہا تھا۔ توجہ پھر ہوسٹس کی طرف مبذول ہوئی۔

وہ ایک ٹرے میں ریفریشمنٹ کے ڈبے رکھے مسافروں کو بانٹتی بانٹتی مجھ تک آ پہنچی۔ میں نے اپنا ڈبہ اٹھایا اور میرے ساتھ بیٹھے لڑکے نے بھی ہوسٹس کو دیکھتے ہوئے مسکرا کر ایک ڈبہ اٹھا لیا۔ ہوسٹس دائیں طرف والی سیٹ کی طرف مڑی اور وہاں کچھ لمحے خاموش کھڑی رہی۔ پھر مدھم سی آواز میں بولی ''ایکسکیوز می سر۔''

نیم دراز شخص نے اپنی آنکھیں کھولیں، ہوسٹس کی طرف دیکھا اور دوبارہ بند کر لیں۔ ساتھ بیٹھی بیوی نے بھی گردن گھما کر اپنے شوہر کی طرف دیکھا اور دوبارہ ونڈو سے باہر دھند میں لپٹی چاندنی کو دیکھنے لگی۔

ہوسٹس کچھ دیر رکی رہی۔ جب ان دونوں نے ڈبے نہ اٹھائے تو آگے بڑھ گئی۔

پھر وہی آوارہ سوچ...... ''اس طرح نظر انداز کرنے کا کیا مقصد ہے؟'' یہ ٹرین کا دوسرا

وسل تھا۔

کچھ دیر فضولیات سوچنے کے بعد میں آنکھیں بند کیے سونے کی کوشش میں تھا کہ ہوسٹس کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''جی سر'' وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر میرے ساتھ بیٹھے اس چھچھورے لڑکے کے سوال کی منتظر تھی۔

''آپ کے پاس نئے سانگز نہیں ہیں؟''

''سر یہی ہیں۔''

''یہ تو بہت پرانے ہیں، گھسے پٹے سے''

''سر کچھ اور چاہیے آپ کو؟''

''ہاں چاہیے تو ہے......مگر آپ کے پاس ہے ہی نہیں۔'' اس لڑکے کی آنکھوں میں شرارت تھی، وہ دوبارہ بولا ''اگر میں اپنی یو۔ایس۔بی دوں تو آپ وہ گانے چلا سکتی ہیں؟''

''سوری سر۔ایسا نہیں ہوتا۔'' ہوسٹس نے نرم سنجیدگی سے مختصر سا جواب دیا۔ مجھے اس چھچھورے کی بات انتہائی بے تکی لگی، بھئی من پسند گانے سننے ہیں تو اپنے سسٹم میں ساتھ رکھو ہوسٹس کی جگہ میں ہوتا تو یہی کہتا، مگر وہ تو نوکری کر رہی تھی۔ وہ کیسے کہہ سکتی تھی؟

''کیسا نہیں ہوتا؟'' اس چھچھورے نے یہ جملہ بڑے بھونڈے انداز میں کہا۔ ہوسٹس نے واپس مڑتے مڑتے دائیں سیٹ والے شخص کو دیکھا، میری بھی نظر اس کی طرف گئی تو وہ اس چھچھورے لڑکے کو گھور رہا تھا۔

بس اس بار میرے خیالات نے تیسرا اور آخری وسل بجایا اور ٹرین کو سمت مل گئی۔

''یقیناً ان میں محبت رہی ہوگی۔اس شخص کی نظر میں جو تلخی تھی وہ چیخ چیخ کر پکار رہی تھی، کہ کمینے یہ بکواس بند کرو۔خبردار اگر ایک لفظ بھی فضول بولا تو......ایسی وحشت تو صرف عاشق کی آنکھوں میں دیکھنے کو ملتی۔''

''ہوا کچھ یوں ہوگا کہ محلے یا کالج میں یہ اکٹھے ہوں گے اور دونوں کے درمیان عاشقی چلی ہوگی، لڑکی کی کوئی مجبوری ہوگی، شادی نہ کرنے کی کوئی وجہ رہی ہوگی۔اور پھر شکستہ دل لڑکے نے انتقاماً کسی اور سے شادی کر لی۔مگر اس کے اندر اب بھی ایک خلش موجود ہے، وہ اب بھی

ناراض ہے، بجھا بجھا سا ہے۔ ہوسٹس کی انسلٹ ہوتے دیکھنا بھی اسے مشکل لگا ہے۔ بیوی یہ سب جانتی ہے اسی لیے وہ ہوسٹس کو نظرانداز کرتی رہی۔''

''کچھ تو ہے...... کچھ نہ کچھ تو ضرور ہے۔ ڈبے نہ اٹھانا اور پھر اس کی بیوی کا گھورنا۔ بیوی سارے معاملے سے واقف ضرور ہے۔ ان دونوں کے معاشقے کے چرچے ہوئے ہوں گے۔ بدنامی اور باتیں چلی ہوں گی۔ ایسی خوش اخلاق لڑکی بے وفا تو نہیں ہوسکتی، یقیناً کہیں نہ کہیں کچھ کمی رہی ہوگی۔''

میرے دماغ میں جیسے فلم کا سکرپٹ بنتا جا رہا تھا اور میں ان دونوں کے رویوں سے مزید کڑیاں جوڑتا کسی بامعنی اختتام تک پہنچنا چاہ رہا تھا۔ یہ کیسی فضول سوچ تھی، میں دل میں خود پر ہنسا۔

دو گھنٹے سے زیادہ وقت گزر چکا تھا۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی میں کلومیٹرز کم ہو رہے تھے۔ شاید پچھلی سیٹوں پر سے کسی نے کال بیل بجائی، ہوسٹس اٹھ کر چلی آ رہی تھی۔ اس کی نظریں اب بھی اسی شخص پر تھیں جو گود میں بچہ لیے، آنکھیں موندے سیٹ پر نیم دراز تھا۔ گود میں لیٹے بچے نے انگڑائی لے کر آنکھیں کھولیں، سامنے آتی ہوئی ہوسٹس کو غور سے دیکھا تو اس کے چہرے پر ایک خوشی کی لہر دوڑ گئی...... وہ اٹھ بیٹھا...... اور اپنے ایک ہاتھ کی انگلی ہوسٹس کی طرف بڑھائی۔ دوسرے ہاتھ سے باپ کے چہرے کو متوجہ کرنے کیلئے چھوا...... بچے کی پُر جوش آواز خاموش بس میں سنائی دی......''بابا...... نینی پھپھو......'' میں لرز کر رہ گیا...... خیالات کی ٹرین اچانک الٹ گئی، ڈبے لڑھکتے ہوئے نیچے کھائیوں میں جا گرے......

میں نے ہوسٹس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر وہی خوبصورت مسکان لوٹ آئی تھی، مگر اگلے لمحے غائب بھی ہوگئی جب اس بچے کی ماں نے بچے کے ہاتھ کو جھٹکتے ہوئے کہا ''چُپ بدتمیز......'' ماں کی آنکھوں میں غضب دیکھ کر بچہ سہم گیا...... ہوسٹس کے قدم کچھ پل کے لیے وہیں رک گئے۔

انجان سناٹے میں جذبوں کی چیخ سنائی دی......
فاختاؤں کے پَر ٹوٹ کر گر پڑے......
فاصلے اور بڑھ گئے......

پھانسی

یہ کہانی دھند نے لکھی ہے اور آپ تو جانتے ہیں کہ دھند ہمیشہ ظالم کہانیاں لکھتی ہے۔
جو ابھی ابھی سفید گاڑی یہاں سے گزری ہے، اس میں سوار تین لوگ اس کوشش میں ہیں کہ صبح ہونے سے پہلے سپریم کورٹ تک پہنچ جائیں۔ دورانِ سفر جرم اور مجرم ان کا موضوع ہے...... اس گاڑی کو بہت دور جانا ہے۔ لیکن...... دھند گہری ہے، بہت گہری ہے...... کہ جیسے جہالت ہو...... جہالت جیسی گہری دھند میں اس گاڑی کی رفتار بیس کلومیٹر فی گھنٹہ سے بھی کم ہے۔ یعنی بہت آہستہ، بہت سست...... بالکل ایسے ہی سست جیسے کسی بدنظم معاشرے کا نظام ہو......

عبداللہ ڈرائیور کی آنکھیں دھند کو کاٹ کر سامنے سڑک پر راستہ تلاش کر رہی ہیں، ساتھ ہی سیٹ پر بیٹھے وکیل صاحب اپنے ہاتھوں کو بغلوں میں دبائے، سمٹے بیٹھے ہیں اور پچھلی سیٹ پر ایس ایچ او دین الٰہی دراز ہے۔

کل عدالت میں کسی کی زندگی اور موت کا فیصلہ ہے اور یہ تینوں لوگ اس فیصلے کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ دلیلوں اور ثبوت میں وزن ہوا تو موت یقینی ہے، لیکن اگر ڈرائیور نے کوتاہی دکھائی اور گاڑی وقت پر نہ پہنچ سکی تو ایک مجرم کی زندگی کے امکانات پختہ ہو سکتے ہیں۔

وکیل صاحب نے اپنے اکڑے ہوئے جسم کو ڈھیلا چھوڑا اور ایک گہری سانس لے کر بہت پُرفکر انداز میں بولے؛

''اکثر سوچتا ہوں...... کہ مجرم بڑی سے بڑی سزا سے بھی کیوں نہیں ڈرتا؟ وہ جرم سے توبہ کیوں نہیں کر لیتا؟''

پچھلی سیٹ پر لیٹے ایس ایچ او کی آواز جو قدرے بھاری تھی، سنائی دی؛

''او جی...... بے غیرت ہوتے ہیں یہ لوگ...... جرم ان کی عادت میں ہے، ماں باپ کی تربیت ہی ایسی ہوتی ہے۔ کچھ حرام کھانے کی لت بھی پڑ جاتی ہے۔''

وکیل صاحب کو جواب نامعقول لگا، انھوں نے گردن گھما کر پیچھے دیکھا تو ایس ایچ او سگریٹ کی ڈبیا میں سے سگریٹ نکال رہا تھا۔

گاڑی میں دیا سلائی جلتے ہی مٹیالی روشنی پیدا ہوئی، جس میں ایس ایچ او کا کالا چہرہ واضح دکھائی دینے لگا۔

سگریٹ جلانے کے بعد وہ بولا؛

''او جی ہم نے بڑے بڑے کمینوں کو مارا ہے۔ جب ڈپٹی صاحب ہوتے تھے تھانے میں تو سیدھا اِن کاؤنٹر ہوتا تھا۔''

اس نے بات کہہ کر کش لگایا، دھواں باہر چھوڑا جو کہ ایک قہقہے نے غائب کر دیا؛

''ایک دفعہ جی...... میں نے بڑے مشہور قاتل کو پکڑا۔ حرامزادے نے نو قتل کیے ہوئے تھے۔ کسی کے ہتھے نہیں چڑھتا تھا۔ پکڑ لیا...... وہ دو راتیں تھانے میں رہا...... اس کے آڈر آ گئے...... آڈر سرکاری نہیں...... ڈپٹی صاحب کے...... ہم موٹروے کے پار اسے لے گئے اور وہاں جا کر کہا بھاگ جا...... اتنا کمینہ تھا...... بولا تم مجھے مارنے آئے ہو، میری زندگی لینے۔ اور میں تمہارا ہی حکم مانوں؟ نہیں بھاگتا...... سینے پر گولی مارو......

ہم نے تو کام ہی کرنا تھا جی...... بس میں نے گولی چڑھائی اور کنپٹی پر پستول رکھ کر بولا کہ چل فیر...... پڑھ لے کلمہ......

اس بے غیرت کی آنکھوں میں ڈر نہیں تھا...... بولا کس کا کلمہ؟ جس سے زندگی مانگی اور دے نہیں سکا؟ کہانیاں نہ ڈال سیدھی گولی مار اور ختم کر قصے کو۔

''لو جی...... میں نے گھوڑا دب دیا...... اس کا بھیجا نکل کر وہ پار دوسرے بَنے پر گرا۔''

ایس ایچ او نے بات ختم کرتے ہی ایک قہقہہ لگایا...... وکیل صاحب کا بے تاثر چہرہ اٹھا اور اندھیرے میں اس کا منہ تلاش کرنے لگا۔ ڈرائیور دونوں ہاتھوں میں سٹیرنگ تھامے نظریں سامنے گاڑے دھند میں سے راستہ تلاش کر کے گاڑی کو رفتہ رفتہ آگے لیے جا رہا تھا۔

''لو جی اک ہور سنو......ہم نے تین لوگوں کے اِن کاؤنٹر کیے۔ لاشیں اٹھا کر تھانے کے صحن میں رکھ دیں۔ سردیوں کے دن تھے...... ہوا کیا جی......رات کوئی ایک بجے کا وقت تھا۔ ہم کمرے میں بیٹھے ہیٹر سیک رہے تھے اوران لاشوں میں سے ایک اٹھ کھڑی ہوئی۔''

ایس ایچ او نے ایک بھرپور قہقہہ لگایا، وکیل صاحب نے ایک مرتبہ پھر اس کے تاثرات دیکھنے کی کوشش میں اپنی گردن پیچھے گھمائی۔

''ادھر تو سب نے شور مچا دیا۔ بندے کو چار فیر لگے تھے جی......اور جب وہاں سے اٹھا کر لائے تھے تو مرا ہوا تھا......اب مرا ہوا بندہ اٹھ کھڑا ہو......تو بڑے بڑوں کا مُوت نکل جاتا ہے۔ ادھر تو بھکل مچ گیا۔ میں نے فیر بندوق لی اور پہلے ایک فیر کیا......وہ اسے لگا نہیں۔ دوسرا کیا تو سیدھا سینے پر لگا۔ لو جی دوبارہ مر گیا، حیرانی کی بات ہے جی۔''

وکیل صاحب کے منہ سے صرف ''ہوں'' نکلا اور وہ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔

گاڑی گہری دھند کاٹتے ہوئے بہت سست روی کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھی۔ وکیل صاحب نے اپنے ہاتھوں کو گرم کرنے کے لیے آپس میں رگڑا اور بولے؛

''دیکھو کل کیا ہوتا ہے...... اس بندے کو پھانسی کی سزا ہو جائے گی۔ پاگل پن کی ایکٹنگ کرتا ہے، دراصل وہ پاگل ہے نہیں۔''

وکیل صاحب کے فوراً بعد ایس ایچ او بولا؛

''جی جی...... یہ حرامی لوگ ہوتے ہیں جی......مکر کرتے ہیں بین چو......''

ڈرائیور جو کافی دیر سے ساکت و خاموش تھا اور آنکھیں بڑی کیے، سٹیرنگ پر جھکے دھند میں سے راستہ تلاش کرتے آگے بڑھ رہا تھا، حرکت میں آیا۔ اس نے بیک ویو مرر میں سے ایس ایچ او کو دیکھنے کی کوشش کی لیکن پیچھے بالکل اندھیرا تھا۔ پھر اپنی کمر کو سیٹ کے ساتھ ٹکا کر بولا؛

''سر جی......کیا پھانسی......مجرم کے ساتھ ساتھ جرم کو بھی مار دیتی ہے؟''

اس نے سوال وکیل صاحب سے پوچھا تھا، وکیل صاحب نے اِس کی بات سنتے ہی ہاتھ بغلوں میں دبائے اور بولے؛

''کہاں مرتا ہے جرم...... جرم تو باقی رہتا ہے، اتنی پھانسیاں ہوتی ہیں۔ قتل، زنا، چوریاں تو پھر بھی ہوتے رہتے ہیں۔ جرم تو اپنی جگہ پر رہتا ہے، بس مجرم ہی مرتا ہے۔''

''سر جی...... میں نے اپنی زندگی میں بس ایک ہی پھانسی دیکھی ہے۔ بڑی عجیب...... بہت ہی ڈراؤنی پھانسی......اور میں جب بھی اس کے بارے میں سوچتا ہوں تو دن کی روشنی میں بھی ڈر لگنے لگتا ہے۔''

وکیل صاحب ڈرائیور کی بات سن کراس کی جانب کھسکے؛

''اچھا؟ ایسا کیا تھااس پھانسی میں؟''

''بہت بھیانک تھی سر جی۔''

میں نے بی اے پاس کرنے کے بعد بہت جگہ کام کیا۔ میری کسی سے بنتی نہیں تھی۔ ہر بار نوکری سے نکال دیا جاتا تھا اور پھر نوکری آسانی سے ملتی بھی کہاں ہے۔ دوستوں یاروں نے مشورہ دیا کہ ٹیکسی لے لوں۔ میں نے قسطوں پر ایک ٹیکسی لے لی۔ دن چلاؤں رات چلاؤں اپنی مرضی ہوتی تھی۔ ٹیکسی کی سواریاں بھی کم ہی ہوتی ہیں۔ مجھ سے زیادہ تو رکشے والے کما لیتے تھے۔

پر پھر بھی دن میں کوئی پانچ سات سواریاں بھی مل جائیں تو اچھی دیہاڑی لگتی تھی۔ زیادہ وقت فارغ رہتا تھا۔ میں نے اڈے پر ایک چھپر ہوٹل پر بیٹھنا شروع کر دیا۔ کبھی اخبار پڑھ لیتا تھا کبھی ٹی وی پر خبریں سن لیتا تھا، سواری آ گئی تو اسے اس کی جگہ پر پہنچا کر واپس وہیں پر بیٹھ جاتا تھا۔''

اتنا کہہ کر ڈرائیور خاموش ہو گیا، وکیل صاحب ڈرائیور کی خاموشی دیکھتے ہوئے بولے؛

''اچھا تو پھر......؟ تم پھانسی کے بارے میں کچھ کہہ رہے تھے۔''

''جی سر جی۔ میں نے اُسے اسی اڈے پر دیکھا تھا۔ وہ تب ہوگا کوئی پانچ سال کا۔ گرمیاں تھیں جب وہ ناریل بیچ رہا تھا۔ رات کے ایک بجے۔

ایک بندے نے کرنڈی کا سوٹ پہنا ہوا تھا، ہاتھ میں بیگ تھا۔ بڑی جلدی میں تھا، بس کی طرف تیز قدموں سے چلتا ہوا جا رہا تھا کہ اس بچے سے ٹکر ہو گئی، سارے ناریل نیچے گر گئے۔ بچے نے ناریل اٹھائے اور پلیٹ میں رکھے، جس ہوٹل کے بینچ پر میں بیٹھا تھا ساتھ ہی ٹونٹی سے دھونے لگا۔

سر جی......اُس رات میں نے اس کے منہ پر جو نیند اور بھوک دیکھی تھی، وہ میں نہیں بھول سکتا۔ کبھی بھی نہیں بھول سکتا۔''

وکیل صاحب نے سر اثبات میں ہلایا؛

''ٹھیک کہتے ہو...... نینداور بھوک ایسی ظالم چیزیں ہیں جو اپنی ضد منوا کر رہتی ہیں۔ جب تک کھاؤ گے نہیں چین نہیں آئے گا، جب تک سو نہیں جاؤ گے تو تکلیف میں رہو گے۔ ان سے پیچھا نہیں چھڑوایا جا سکتا۔ اچھا پھر؟''

ڈرائیور نے دوبارہ بولنا شروع کیا؛

''پھر کیا جی۔ اس دن کے بعد وہ بچہ میری نظر میں آ گیا۔ پہلے کبھی میں نے غور نہیں کیا تھا لیکن پھر تو اخبار یا ٹی وی کی طرف میری توجہ اس وقت جاتی جب وہ ارد گرد نہیں ہوتا تھا۔ گرمیاں گزر گئیں، سردیاں آ گئیں۔ اور وہ انڈے بیچنے لگا۔ ایک ایک سواری کے پیچھے بھاگتا اور منتیں کرتا۔''

وکیل صاحب نے ڈرائیور کی بات کاٹی؛

''اس کا باپ نہیں تھا؟''

''کہتے ہیں جی نشے کرتا تھا۔ کچھ مہینے پہلے کہیں سے اس کی لاش ملی تھی۔ پہلے تو ان کے پاس رہنے کو چھت تھی لیکن جب کرایہ نہ دیا تو مالک مکان نے سامان اٹھا کر باہر پھینکا اور انھوں نے اڈے میں ہی ایک طرف پڑے خالی کنٹینر کو اپنا گھر بنالیا۔

میونسپل کمیٹی والے آئے تو انھوں نے پہلے آرام سے خالی کرنے کو کہا، تین چار دن جب کنٹینر خالی نہیں کیا تو بستر گٹھڑی برتن اٹھا کر باہر مارے...... اور کنٹینر کو کرین کے ساتھ وہاں سے اٹھا کر جانے کدھر لے گئے۔ پھر وہ انہی سردیوں میں ایک کھوکھے کی آڑ میں بیٹھنے لگے۔

ماں تھی کہ چھوٹی سی بچی کو گود میں لٹائے، سر پر ڈوپٹہ باندھے دیوار سے لگ کر بیٹھی رہتی اور کھانستی رہتی۔ وہ ابلے انڈے بیچتا پھرتا۔ روٹی کے وقت پر روٹی لیتا جا کر ماں کو کھلاتا خود کھاتا۔ پھر ایک دن، اس کی ماں کو خون کی الٹی آئی اور اس کی کھانسی چپ ہوگئی، پر بہن نے رونا شروع کر دیا۔ دن رات روتی رہتی تھی۔ وہ اسے وہیں لٹا کر آس پاس انڈے بیچتا رہتا، نظر اس کی ایک جگہ ہی ٹکی رہتی تھی۔ انڈے نکال کر دیتے ہوئے، پیسے پکڑتے ہوئے۔ گاہک کے بلانے پر اس کے پاس جاتے ہوئے...... اس کی نظر اسی کھوکھے کی طرف رہتی تھی جہاں بہن کو لٹا کر آتا تھا۔ اس کے گاہک کچھ کم ہو گئے تھے۔

ایک دن میرے ساتھ بیٹھے بندے نے اسے بلا کر پوچھا انڈا کتنے کا ہے؟ اس نے پیسے بتائے تو وہ بندہ کہنے لگا کہ ایک دے دو۔ جب برتن میں سے انڈا نکالا تو اس کا چھلکا کہیں سے

اترا ہوا تھا کہیں سے لٹک رہا تھا۔ چھلکے کی چھوٹی دراڑوں میں جگہ جگہ میل پھنسی ہوئی تھی۔ اتنا غلیظ انڈا کون لینا چاہے گا جی؟ کون کھائے گا؟ بندے نے اس سے پیسے واپس لیے اور انڈا نہ خریدا۔ میں بھی ہوتا تو یہ کام ہی کرتا...... پر پیسے واپس نہ لیتا۔

کچھ مہینے بعد وہ روٹی مانگ کر کھانا سیکھ گیا تھا، جو مسافر ہوٹل پر کھانا کھانے بیٹھتے تو پہلے انہیں انڈے بیچنے کی کوشش کرتا وہ نہ مانتے تو کہتا صاحب روٹی کھانی ہے، کئی خدا ترس لوگ ہوتے تھے جو اسے روٹی لے دیتے تھے۔ اب بس ایک ہی خرچہ تھا کہ وہ بہن کے لیے دودھ خریدتا تھا اور اس کی بہن، کبھی چپ نہیں ہوتی تھی، روتی رہتی تھی روتی رہتی تھی...... وہ چپ کروانے کی کوشش میں رہتا تھا، لیکن اس سے کہاں چپ ہوتی تھی۔

وہ جواڈا تھا نا سر جی۔ اس کے پاس ہی ایک طرف چھوٹا سا پارک تھا، جہاں پھول لگے ہوئے تھے، گھاس......اور ارد گرد گرل لگی ہوئی تھی۔ وہاں پر کچھ اور بچے بھی آ کر رہنے لگے تھے۔ اسی جیسے بچے۔ کوئی ٹافیاں بیچتا تھا، کوئی نمکو دال۔ کوئی بچوں کے چھوٹے چھوٹے کھلونے اور کئی بھیک بھی مانگتے تھے۔

اسی پارک میں جہاں گورنمنٹ نے پھول لگائے تھے وہاں پر کئی پوڈری رات کو آ کر لیٹ جاتے، نشے کے ٹیکے لگاتے اور پڑے رہتے۔

خیر جی......ان دنوں میں اس طرح کی سردی تھی، دھند بھی بڑی ہوتی تھی۔ کچھ دن دھوپ نکلی، لیکن پھر بارشیں ہونے لگیں۔

اس کے بعد وہی دھند اتر آئی۔ ایک رات میں چھپر ہوٹل پر بیٹھا چادر لپیٹ کر چائے پی رہا تھا کہ دیکھا اس کی بہن بہت رو رہی ہے۔ وہ ہوٹل والے کے پاس آیا اور اس سے دودھ مانگنے لگا۔ ہوٹل والے نے انکار کیا تو میرے جی میں آیا کہ میں لے دوں، دھیان جیب کی طرف گیا تو یاد آیا کہ جو پیسے جیب میں تھے اس کی چائے لے کر پی چکا ہوں اور اب خود کسی سواری کے انتظار میں بیٹھا ہوں۔ خیر وہ واپس جا کر اسے پھر چُپ کروانے لگا، اتنے میں مجھے ایک سواری مل گئی، میں نے اس سے پیسے طے کیے اور کہا کہ مہربانی ہوگی اگر کچھ ابھی دے دو۔ پیسے لے کر ہوٹل والے سے کہا کہ کسی کے ہاتھ بچے کو دودھ پہنچا دے۔ خود سواری لے کر چلا گیا۔''

ڈرائیور خاموش ہوگیا۔ دھند کچھ زیادہ گہری ہو چکی تھی۔ اس کی نظریں راستہ تلاش

کرتے کرتے تھک رہی تھیں، بوجھل پن اس کے چہرے پر واضح دکھائی دے رہا تھا۔ وکیل صاحب کچھ وقت کے لیے تو اس کے بولنے کا انتظار کرتے رہے پھر بولے؛

''لیکن اس سارے واقعے میں پھانسی کا ذکر کہاں ہے......اسے پھانسی کیوں ہوئی؟''

ڈرائیور سوال سن کر کچھ پل کے لیے چپ رہا پھر کہنے لگا؛

''سر جی۔ پھانسی سے پہلے کیا ہوا وہ سنیں۔ میں نے اس رات سواری اتاری اور پھر گھر چلا گیا۔ اگلے دن دوبارہ اڈے پر آیا تو وہ بالکل چپ تھا۔ اس کے منہ پر اداسی تھی۔ اس کے منہ پر وہ نیند نہیں تھی، وہ بھوک نہیں تھی۔ بس اداسی تھی۔ وہ بیٹھا ایک بت سا لگ رہا تھا۔ اس کے آس پاس اس کی بہن نہیں تھی۔ وہ مر گئی تھی۔''

گاڑی کے سامنے دھند کا ایک دیو سا ظاہر ہوا، ڈرائیور نے بریک دبائی۔ گاڑی ایک جھٹکے سے رکی اور پھر اسی سست رفتار سے چلنے لگی۔

''پھر سر جی۔ میں کئی مہینے وہاں پر رہا۔ اس نے انڈے بیچے نہ ہی ناریل۔ بس وہ اداس منہ لے کر کبھی کہیں بیٹھا نظر آتا کبھی کہیں۔ اس کے کپڑے میلے ہونے لگے۔ اس کے بال بڑھنے لگے۔ کبھی ہنسا نہ مسکرایا۔ بس جہاں بیٹھا ہوتا، سامنے گھورتا رہتا۔ ایک سردی میں اسے سخت بخار بھی ہوا......وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر زور زور سے کھانستا، دوسرے ہاتھ سے گلے کو پکڑ لیتا...... سردی سے ٹھٹھرتا رہتا......کانپتا رہتا......لیکن منہ پر اداسی اسی طرح رہتی۔ شکل میں کوئی فرق نہیں آتا تھا۔ میں اسے دیکھنے کے سوا کیا کر سکتا تھا؟ بس ایک طرف بیٹھا دیکھتا رہتا تھا۔

میں جب تک وہاں رہا میں نے اسی حال میں اسے دیکھا۔ پھر جب مجھے نوکری مل گئی تو میں نے ٹیکسی چلانی چھوڑ دی۔ پر وہ ایک نوکری چھوڑ، تین جگہ کام کیا......جیسے پہلے نہیں بنتی تھی تب بھی کسی سے نہ بنی تو نوکریاں چھوڑتا رہا۔ آخر سات سال کے بعد دوبارہ پرانے کام کی طرف آ گیا۔ ٹیکسی چلانی شروع کر دی۔ اس بار جب میں اڈے میں آیا تو وہ بالکل بدل چکا تھا۔ نہیں بلکہ اس کا صرف قد ہی لمبا ہوا تھا باقی منہ پر وہ اداسی اسی طرح تھی۔ اداسی کی تو ایک شکل ہوتی ہے جی۔ نہ عمر بڑھتی ہے نہ ہی شکل بدلتی ہے۔ اس کی شکل تو اپنی تھی بھی نہیں۔ اداسی اس کی شکل ہو گئی تھی اور وہ سات سال کے بعد بھی مجھے ویسا ہی نظر آیا۔ اس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے، غلیظ ہو گئے تھے، پاس سے گزرتا تھا تو بدبو آتی تھی۔ بال بڑھ چکے تھے اور یوں لگتا تھا کہ جیسے مٹی میں سر دے کر آیا

ہے۔ کسی سے بات نہیں کرتا تھا بس چپ چاپ گھومتا رہتا تھا یا بال کھجا تا رہتا تھا۔ انگلیوں میں انگلیاں پھنسا کر انگوٹھے گھما تا رہتا تھا۔

وہاں پر جو پارک بنا تھا اس کے اندر اب گھاس نہ پھول...... جو لوہے کی گرل تھی وہ بھی وہاں نہیں تھی۔ بس کیاریوں میں ٹھیکے پڑے ہوتے تھے اور ان ٹیکوں کی طرح نشئی۔ اڈے پر گاڑیوں کا شور بڑھ گیا تھا، سڑک زیادہ ٹوٹ چکی تھی، بھیک مانگنے والے بچے بڑھ گئے تھے، چھوٹی موٹی چیزیں بیچنے والے بھی زیادہ تھے۔ بھوک بھی بڑھ گئی تھی اور نشئی بھی۔ وہ بھی ان نشئیوں کے ساتھ ویسا ہی لگتا تھا۔ میرا خیال ہے نشہ نہیں کرتا تھا۔ ہاں وہ نشہ نہیں کرتا تھا۔''

ڈرائیور بات کرتے کرتے اس وقت رک جاتا جب دھند گہری ہوتی، ڈرائیور کی آواز ختم ہوتی تو ایس ایچ او کے خراٹے واضح سنائی دینے لگتے۔ وہ ہر بات سے بے فکر گہری نیند سو رہا تھا۔

ڈرائیور نے سامنے والے دھندلے شیشے پر کپڑا پھیر کر اسے صاف کیا اور بولا؛

''سردیاں ہی تھی جب میں نے دوبارہ ٹیکسی چلانی شروع کی تھی، عجیب کام ہوا...... وہاں کے چھوٹے بچے ایک ایک کر کے مرنے لگے۔ ایک دن پہلے چنگے بھلے ہوتے اگلے دن صبح ان کا پھولا ہوا جسم فٹ پاتھ پر پڑا ہوتا تھا۔ ہفتے میں ایک آدھی لاش اٹھا کر دو چار لوگ پاس کے قبرستان میں دفن کر آتے تھے۔ پر سب کے اندر ایک خوف سا تھا کہ ایسی کیا بیماری آ گئی ہے کہ جو ایک رات میں بچے کو نگل جاتی ہے اور صبح لاش پھول کر اتنی خوفناک ہو جاتی ہے اور صرف بچے ہی کیوں مرتے ہیں؟

کام بڑھتا گیا، فٹ پاتھ پر بچے گھٹتے گئے۔ لوگوں کو زیادہ خوف آنے لگا۔ پر سر جی......اس کے منہ پر وہی اداسی رہی۔ اس کی شکل بدلی نہ انداز۔ اس نے کسی سے بات کی نہ کسی سے کچھ مانگا۔

بس پھر ایک صبح میں اڈے پر چائے پی رہا تھا کہ اچانک شور مچا۔ ایک رش سا لگ گیا، میں بھی پیالی رکھ کر اس رش میں چلا گیا۔ دیکھا تو وہ وہاں پر الٹا پڑا ہوا تھا اور لوگ اسے لاتیں مار رہے تھے۔ اسے کسی نے بچے کو ٹیکا لگاتے ہوئے دیکھ لیا تھا......''

وکیل صاحب چونک گئے؛

''اوہ مائی گاڈ......بچوں کو وہ مار رہا تھا؟''

''جی سر جی۔ وہ ان فٹ پاتھ کے بھوکے ننگے بچوں کو ٹیکے لگا کر مارتا رہا۔ کئی بچوں کی جان لی، کئی دلوں میں خوف بھر دیا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ لوگ اسے اس لیے نہیں مار رہے تھے کہ اس نے بچوں کی جان لی، اس لیے مار رہے تھے کہ اس نے انھیں ڈرایا بہت تھا۔ اس دن مجھے پتہ چلا کہ ان لاوارث بچوں کے کتنے وارث ہیں۔ پورا اڈا ہی ایسے لگ رہا تھا کہ جیسے ان بچوں کا ماں باپ ہے۔ وہ چپ چاپ مار کھا رہا تھا۔ نہ کوئی آواز نہ کوئی چیخ......اسے لوگوں کی لاتوں کی تکلیف نہیں ہو رہی تھی۔ لگتا تھا کہ وہ کسی بوری کو مار رہے ہیں۔ اس کے منہ سے، ناک سے کان سے خون نکل رہا تھا۔ پر اس کے منہ پر وہ اداسی اسی طرح تھی۔

پھر سر جی۔ اس فٹ پاتھ سے مارتے ہوئے، گھسیٹتے ہوئے لوگ پارک میں لے آئے۔ میں دیکھنے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا، دیکھتا رہا۔ ساتھ ساتھ چلتا رہا۔

گالیوں کے شور میں سے ایک آواز آئی، اس حرامزادے کو لٹکا دو تا کہ سب کو پتہ چلے کہ بچوں کو قتل کرنے کی سزا کیا ہوتی ہے۔ میرے پورے وجود میں ایک لہر سی اٹھی، اور خود سے کہا بول......عبداللہ......اب تو کچھ بول......اتنے سالوں سے چپ ہے اب ہی بول پڑ...... پر سر جی بولا نہیں گیا۔ اس شور کو دیکھ کر اس ہنگامے کو دیکھ کر میرے منہ پر تالہ سا لگ گیا تھا۔ میں چپ تھا......اور سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ رسہ بھی آ گیا، سامنے پارک میں لگے ہوئے پول کے ساتھ باندھ بھی دیا اور اس بدنصیب کو گھسیٹ کر اسی طرف لے جانے لگے۔ اس نے سر اٹھایا اور سامنے لٹکتے پھندے کو دیکھا جو ابھی کچھ دور تھا اور پھر اس کی نظریں ادھر ہی جم گئیں۔ ابھی دو قدم پیچھے ہی تھے کہ اس کا بے خوف چہرہ ایک طرف ڈھلک گیا......جسم بے جان ہو گیا......''

گاڑی میں ایس ایچ او کے خراٹوں سے بھی زیادہ اونچی دو آہیں سنائی دیں۔

''جن لوگوں نے اسے پکڑا ہوا تھا وہ رک گئے۔ ایک بولا یہ تو بے ہوش ہو گیا...... دوسرے نے اس کو زمین پر لٹایا اور کہا مر گیا ہے......تیسرا رش میں سے نکل کر آگے آیا اور بولا...... مکر کر رہا ہے مادر چو...... چوتھا بولا اسے لٹکاؤ، تا کہ سب کو پتہ چلے کہ انجام کیا ہوتا ہے۔ شور پھر بڑھنے لگا۔ کوئی کچھ کہہ رہا تھا، کوئی کچھ......اور میں ایک طرف کھڑا چپ چاپ دیکھ رہا تھا۔

اس بے جان جسم کو اٹھایا اور رسے کے ساتھ لٹکا دیا۔

عجیب پھانسی تھی سر جی...... میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سامنے اداسی کی شکل والی

لاش......جور سے پر جھول رہی تھی......کس کی تھی؟

مجرم کی......؟

جرم کی......؟

بھوک کی......؟

نیند کی......؟

یا......یا......انصاف کی......؟''

ڈرائیور نے آخری الفاظ ادا کرنے کے بعد گاڑی کو سڑک کے ایک کنارے پر لا کر بریک لگائی اور پیشانی سٹیرنگ پر ٹکا دی......پچھلی سیٹ پر ایس ایچ او کے خراٹوں کی آواز ابھی تک اسی طرح آ رہی تھی۔وکیل صاحب کافی دیر تک ڈرائیور کی طرف تکتے رہے۔اور پھر بولے؛

''گاڑی کیوں روک دی؟''

ڈرائیور نے سر اٹھایا اور سامنے دیکھتے ہوئے بولا؛

''سر جی......اب گاڑی اور آگے نہیں چل سکتی......دھند بہت زیادہ ہے......''

ٹیکسیاں

زینت کی کلائی میں چوڑیاں کھنکتی تھیں، مگر شاہد ان کی کھنک کو کب سنتا تھا وہ تو اپنے اندر بجنے والے سکّوں کی چھنکار کے تابع تھا۔

سورج کی ٹھنڈی روشنی کمرے میں داخل ہو چکی تھی۔ زینت نے آنکھیں کھولیں اور انگڑائی لی تو جسم پر طاری نیند کے خمار کی میٹھی سی تسکین کو محسوس کیا، چوڑیوں کی کھنک سے پہلو میں لیٹے شاہد کی آنکھ کھل تو گئی لیکن زینت نے جیسے ہی اپنا ہاتھ اس کے سینے پر رکھا تو شاہد کو یاد آیا کہ وہ اٹھتے ہی سگریٹ ضرور پیتا ہے، سو اُس نے سائیڈ ٹیبل سے سگریٹ اٹھایا اور سلگانے لگا۔ زینت کے ماتھے پر بل آئے؛

''ضروری ہے کہ آنکھ کھلتے ہی آپ سگریٹ پئیں؟''

''ہوں......'' شاہد نے ہلکی سی آواز میں کہا اور گہرا کش لگایا۔

''اس کا دھواں میرے سر کو چڑھتا ہے۔''

''تو باہر چلی جایا کرو۔'' شاہد نے بے پروائی کے ساتھ جواب دیا

جواب سن کر زینت نے سگریٹ چھیننے کی کوشش کی تو وہ جھنجھلا کر بولا

''عجیب واہیات عورت ہو۔ بھئی اگر دھواں نہیں پسند تو باہر چلی جاؤ۔ ایسی بچگانہ حرکتیں کرتی اچھی نہیں لگتی۔''

''بچگانہ نہیں ہے، میرے سر میں......''

''میرے کپڑے رکھ دیئے تھے؟'' شاہد نے زینت کی بات سُنے بغیر سوال آگے رکھ دیا۔

''جی رکھ دیے تھے۔''

''اور جوڑا کومنٹس میں کل لے کر آیا تھا، وہ بھی؟''

''جی وہ بھی رکھ دیے تھے۔''

''ہوں...... کپڑے استری کر دو، مجھے جلدی نکلنا ہے۔'' شاہد نے بستر سے اٹھتے ہوئے کہا اور باتھ روم میں چلا گیا۔

زینت نے ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آن کیا تو ویمن ڈے کی خصوصی نشریات کا لوگو سکرین کے ایک طرف کونے میں گھوم رہا تھا اور ایک خوبصورت نوجوان عورت ہاتھ میں ٹیبلٹ لیے کہہ رہی تھی؛

''دھرتی کی زرخیزی اور شہر کی خوشحالی کے لیے مصر کی عزّا اور بابل کی عشتار کے مندروں میں عورت کو ویشیا بنا کر بیٹھا تو دیا گیا مگر دورِ حاضر میں عورت اپنا مقام سمجھ رہی ہے، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے پاؤں پڑی مکار تہذیبوں کی آہنی زنجیریں پگھل رہی ہیں۔ وہ وقت دور نہیں جب عورت کی عظمت کو ہر معاشرہ نہ صرف تسلیم کرے گا بلکہ اسے اس کا اصل مقام بھی دینے پر مجبور ہو جائے گا۔

اُن عورتوں کو میرا سلام جو اپنے وجود کی پہچان رکھتی ہیں اور اُن عورتوں کے لیے ہمدردی جنھیں معلوم ہی نہیں کہ وہ کیا ہیں۔''

زینت نے یہ چند جملے سن کر سر جھٹکا اور ٹی وی بند کر کے کپڑوں والی الماری کی جانب بڑھی۔

کپڑے استری کیے، جوتے پالش کیے، ایک مرتبہ پھر سے سارے سامان کا جائزہ لیا جو شاہد کی ضرورت کا تھا اور کچن میں جا کر ناشتہ بنانے لگی۔ شاہد نے نہا کر کپڑے پہنے اور میز پر ناشتے کے لیے آ بیٹھا۔

ناشتے سے فارغ ہو کر اٹھا تو زینت نے پوچھا؛

''آپ پنڈی کس کے گھر رکیں گے؟''

شاہد نے کاغذات کو دیکھتے ہوئے مختصر سا جواب دیا۔ ''ہے ایک دوست۔''

زینت برتن سمیٹتے ہوئے بولی'' وہ...... کہتے ہیں وہاں سے میوے سستے اور اچھے مل جاتے ہیں، اگر وقت ملے تو لیتے آیئے گا۔''

شاہد کلائی پر گھڑی باندھے ہوئے بیگ کی جانب بڑھا اور بولا "ہاں تمہارے میوے

لینے ہی تو پنڈی جا رہا ہوں۔'' یہ کہنے کے بعد وہ بیگ اٹھا کر دروازے کی طرف چل پڑا۔ زینت کچھ کہنے کے لیے پیچھے تک آئی، اس کا منہ اور باہر کا دروازہ ایک ساتھ کھلے، اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی دروازہ زوردار آواز میں بولا

''چُپ......!''

اور زینت کا منہ بند ہو گیا۔

اچھا یہ رات بھی بہت بڑی کہانی باز ہے۔ اتنی بڑی کہانی باز کہ دن اس کے قصّے سنتا سنتا چکرا کر اس کی گود میں آ گرتا ہے......دن رات کی آغوش میں گر چکا تھا......اندھیرے کا راستہ کاٹ کر روشنیاں پھیلنے لگی تھیں، سردی کی طرح بازار کا شور بھی عروج پر تھا اور پنڈی صدر کے ہجوم میں شاہد کی نگاہیں ٹیکسی تلاش کر رہی تھیں۔

ایک ٹیکسی اس کے قریب آ کر رکی، ڈرائیور نے سر نکال کر شاہد کو مخاطب کیا'' جی سر کدھر جانا ہے؟''

''کسی بھی مناسب سے ہوٹل میں لے چلو، جہاں رات ٹھہرنے کا انتظام ہو جائے۔''

ٹیکسی والے نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیا اور بولا'' ہوں......جی آ جائیں۔ لے جائیں گے۔''

ٹیکسی میں سوار ہو کر شاہد نے ڈرائیور سے کہا'' قریب ہی کسی مناسب ہوٹل میں لے چلو۔ بس رات ہی کاٹنی ہے۔''

''سر جی......ہوٹل بھی مل جائے گا اور باقی سب کچھ بھی مل سکتا ہے......''

''باقی سب کچھ؟''

''پانی وانی، بچی شچی......''

''نہیں نہیں......اس کی ضرورت نہیں۔ بس میں تو......''

''او چلو جی......میں نے تو ایسے ہی کہا۔'' ڈرائیور نے بات پلٹی

ٹیکسی چلنے لگی۔ ابھی کچھ ہی منٹ ہوئے تھے کہ سگنل پر رکنا پڑا، برابر ہی ایک پیلی ٹیکسی آ کر رکی جس میں منہ پر بے تکا میک اپ تھوپے کچھ عورتیں بھیڑ بکریوں کی طرح بھری ہوئی تھیں۔ شاہد نے اس طرف دیکھا تو ان میں سے دو مسکرانے لگیں۔

''یہ کیا طریقہ ہے، ایک ٹیکسی میں کس طرح سے یہ عورتیں بھری بیٹھی ہیں......'' شاہد

ان کی طرف دیکھتے ہوئے نیچی آواز میں بولا

''او جی شام ہوگئی ہے۔ ان کا کام شروع ہوگیا ہے۔ یہ ساری ایک ایک کر کے اترتی جائیں گی اور پھر رات گیارہ بارہ بجے تک ٹیکسی خالی۔'' بتی ہری ہوئی تو گاڑی دوبارہ چلنے لگی۔

''اچھا......عجیب بات ہے۔'' شاہد نے بات آگے بڑھائی

''آپ کو ضرورت ہے تو بتائیں جی...... ابھی میڈم کو فون کر لیتے ہیں۔''

''نہیں نہیں......میں نے کیا کرنا ہے۔''

''جو سارے کرتے ہیں'' ڈرائیور نے بیک ویو مرر میں سے شاہد کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا۔

''یہ میڈم کون ہے؟''

''سر جی بچیاں سپلائی کرتی ہے۔ میرے پاس نمبر ہے اس کا۔''

''اچھا......کیا گاہک گھر لے جاتے ہیں؟''

''ہاں جی اور کدھر۔ پردیسی لوگ ہوٹل میں لے جاتے ہیں۔''

''ہوٹل؟ مگر ہوٹل والے کیسے......''

ڈرائیور نے بات کاٹی ''او جی سب چلتا ہے۔ ہوٹل والے کو کیا پتہ کہ بیوی ہے یا ٹیکسی......''

''ہاں یہ تو ہے۔'' شاہد کے اندر سکّے چھنکنے لگے......

''تو پھر کروں کال جی؟''

''کال......نن......نہیں رہنے دو'' شاہد کچھ گھبرایا۔

''سر جی کچھ نہیں ہوتا۔ گارنٹی ہے میری'' یہ کہہ کر ڈرائیور نے گاڑی ایک طرف لگائی اور موبائل نکال کر نمبر ملانے لگا۔

صدر کے علاقے سے کچھ پرے چرچ اور مسجد کے قریب ایک کسبیوں کا محلّہ ہے، اب وہ اتنا بدنام ہو چکا ہے کہ جو تاجر، سرمایہ دار، سرکاری ملازم دن کی روشنی میں بھی کسی نہ کسی طرح وہاں چلے جاتے تھے، اب رات کے اندھیروں میں بھی جاتے گھبراتے ہیں۔ اس کے بعد یوں ہونے لگا کہ جو سمجھدار قسم کی کسبیاں ہیں انھوں نے کوئی ایک ٹیکسی ڈرائیور پکڑ رکھا ہے جو ان کی

دلالی بھی کرتا ہے اور ٹیکسی بھی چلاتا ہے۔ کچھ ٹیکسی ڈرائیوروں نے پورا دن ذلیل ہونے سے بہتر یہ جانا کہ رات سات آٹھ بجے کسبیوں کے ٹولے کو اپنی گاڑی میں لیا، گیارہ بارہ بجے کے بعد گاڑی خالی ہو جاتی ہے، اچھے پیسے بھی مل جاتے ہیں۔

کچھ ہی دیر کے بعد آبادی سے کچھ دور دونوں ٹیکسیاں کھڑی تھیں اور شاہد اس ٹیکسی کے قریب کھڑا تھا جس میں بھیڑ بکریوں کی طرح عورتوں کو بھرا گیا تھا۔

ایک بے تحاشہ موٹی عورت 'میڈم' جو فرنٹ سیٹ پر بیٹھی تھی، نے ٹارچ کی روشنی پیچھے بیٹھی عورتوں کے چہروں پر ڈالی، شاہد جھک کر دیکھنے لگا۔ ہر ایک اپنا منہ سامنے رکھ رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو ''مجھے لے کر جانا......اسے نہیں......ادھر دیکھو مجھے......'' مگر ان پانچ میں سے ایک تمام باتوں سے بے نیاز بیٹھی دوسری طرف دیکھ رہی تھی۔ چہرے پر سنجیدگی تھی، نین نقش تیکھے تھے، عمر جوانی اور ادھیڑ پن کے درمیان جھولا جھول رہی تھی لیکن آنکھوں میں چمک تھی، اسے دیکھ کر شاہد کے سکّوں کی چھنکار اور تیز ہوئی۔ میڈم کو پیسے دے کر اسے اپنی ٹیکسی میں بیٹھا لیا......

ایک ہوٹل میں کمرہ کرائے پر لینے کے بعد شاہد اور وہ عورت جیسے ہی کمرے میں داخل ہوئے تو عورت نے ایک گہری سی انگڑائی لی، اسے محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے اتنی عورتوں کے درمیان پھنس کر بیٹھنے سے اس کی ہڈیاں آپس میں گڈ مڈ ہو گئی تھیں اور اب اس انگڑائی کے بعد ساری کی ساری اپنی اپنی جگہ پر درست ہوئیں، چہرے پر ایک اطمینان سا اتر آیا۔ صوفے پر بیٹھتے ہی اس نے اپنے پرس میں سے سگریٹ کی ڈبیا نکالی اور سگریٹ سلگانے لگی۔

شاہد اس کی طرف پلٹا ''یہ کیا ہے......؟''

''سگریٹ''

''مگر تم عورت ہو اور اس وقت جب......''

''عورت ہوں تو؟ سگریٹ کی ڈبی پر لکھا ہوا ہے کہ 'صرف مردوں کے لیے؟' اور اس کا کوئی وقت بھی ہوتا ہے؟'' اس نے سر جھٹکا اور ایک کش لگا کر پھر بولی ''میں اپنا کام شروع کرنے سے پہلے ایک سُوٹا ضرور لگاتی ہوں......''

شاہد نے اپنے ہونٹ بھینچے، بیڈ پر بیٹھ کر جوتوں کے تسمے کھولے، اس دوران وہ ایک طرف بیٹھی سکون کے ساتھ سگریٹ پیتی رہی۔ ہر کش گہرا لگاتی، پھر اس کا دھواں بہت آرام کے

ساتھ منہ سے خارج کرتی اور ہونٹوں پر مسکان لیے اس دھوئیں کو فضا میں بکھرتا دیکھتی رہتی۔
جوتے اتارنے کے بعد شاہد بیڈ پر بیٹھا کڑھتا رہا۔
''نام کیا ہے تمہارا؟''
''کیوں نام کا کیا کرنا ہے؟'' وہ مسکراتے ہوئے بولی اور سگریٹ کو بجھا کر شاہد کے قریب آ بیٹھی ''نوشی ہے میرا نام۔''
شاہد اس کے قریب ہوا تو وہ کچھ پیچھے ہٹ کر کہنے لگی؛
''دیکھو......کوئی فالتو کی حرکت نہیں کرنے دوں گی، ہر بات نہیں مانوں گی اور پہلے بتا دوں کہ جو مرد جانوروں کی طرح کاٹتے ہیں وہ بالکل بھی اچھے نہیں لگتے۔''
''ہدایات والی کوئی کتاب مجھے دے دو پڑھ کر شروع کرتے ہیں''
شاہد کی بات سن کر نوشی نے مدھم سا قہقہہ لگایا، آنکھوں میں اسی وقت ایک شرارت سی بھر گئی......شاہد نے قہقہے کی آواز سنتے ہی باہر کے دروازے کی جانب دیکھا......اور پھر اس کے چہرے کی طرف......اندر کے سکّوں کی چھنکار اس قہقہے کی سی سنائی دی، وہ اس کی طرف کھسکا، دونوں کاندھوں پر ہاتھ رکھے اور لبوں کو دیکھتا ہوا منہ قریب لے گیا......جیسے ہی شاہد قریب ہوا اسے بے حد تیز عطر کی خوشبو محسوس ہوئی۔ وہ ناک سکیڑ کر پیچھے ہٹ گیا۔
''یہ کیا بے ہودہ سا پرفیوم ہے؟''
وہ سنجیدہ ہو کر بولی ''جو میں نے لگایا ہے؟''
''ہاں تو اور کیا۔ اتنا گھٹیا......سر چکرا گیا میرا تو۔''
وہ مسکرائی ''سر تو چکرائے گا......سستا ہے نا'' اتنا کہہ کر وہ پھر شاہد کے قریب ہوئی......
''ارے بھئی......نہیں! مجھ سے کچھ بھی نہ ہوگا ایسے تو......تمہارا پرفیوم بہت ہی واہیات قسم کا ہے۔'' شاہد نے اسے پرے دھکیلا۔
نوشی کی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہوئی ''اچھا......خوشبو اڑنے کا انتظار کروں پھر......''
''نہیں تم ایسا کرو......کہ نہا لو......''
''اتنی سردی میں؟ کام پر نکلنے سے پہلے نہا کر تو آئی ہوں۔''
''مگر میں ایسے کچھ کر نہیں سکتا۔ یہ کام کرنا ہے تو کم از کم تمہیں پرفیوم ہی اچھا لگانا چاہیے۔''

اس مرتبہ وہ پھر ہنس دی؛

''اچھا......؟ سارے پیسے خوشبو کی شیشی پر لگا دوں۔ گھر کچھ نہ بھیجوں۔ ایک بار لگو تو سہی تھوڑی دیر کے بعد یہ خوشبو کچھ نہیں کہے گی۔''

''تھوڑی دیر کے بعد کچھ نہیں کہے گی......بکواس !تم بس نہالو......''

''اتنی سردی میں کیسے نہالوں......؟تم نہا کر دکھاؤ تو۔''نوشی کے لہجے میں کچھ تلخی در آئی۔

''میں کس لیے نہاؤں......؟''

''اگر میں کہوں کہ مجھے تم سے بد بو آ رہی ہے......تو؟ پر نہیں...... میرا تو کام ہے...... گندے بد بودار لوگوں کو برداشت کرنا۔''

شاہد نے سر جھٹکا؛

''بے کار بحث میں وقت برباد نہ کرو......''

''سردی نہ ہوتی تو مان بھی لیتی۔ میں نہیں نہا سکتی''

''بہت بدزبان ہو تم......''

ایک لمحے کے لیے وہ بے تاثر چہرہ لیے شاہد کا منہ تکتی رہی، پھر اداس آواز میں بولی ''ہاں، ہوں تو بدزبان ہی۔ اور عورت تو بدزبان ہی ہوتی ہے......عورت بدزبان ہی ہوتی ہے جب اپنے دل کی کہتی ہے......''

''عورت......؟ ہونہہ'' شاہد نے طنزیہ انداز میں اس کی طرف دیکھ کر کہا۔''تم بھی عورت کی کسی قسم میں آتی ہو؟''

نوشی کے چہرے پر بھی ویسی ہی طنزیہ مسکراہٹ ابھری''عورت تو ایک قسم کی ہے، اس کو قسموں میں تو تم نے بانٹا ہے۔ ورنہ عورت تو عورت ہی ہے......''اس نے ایک گہری سانس لی...... اور دوبارہ مخاطب ہوئی''خیر......تمہارا قصور نہیں، تم شریف نظر آتے ہو......اور تم جیسے شریف اپنی بیویوں کے بگاڑے ہوئے ہوتے ہیں......لگتا ہے تمہاری بیوی بھی جی جی کر کے آگے پیچھے گھومتی ہوگی...... وہ بے چاری ہوتی نا تو ابھی جا کر ٹھنڈے پانی میں ڈبکیاں لگا کر آتی......''

شاہد کے ماتھے کے بل بڑھ گئے ......''ایسی ناپاک زبان سے میری بیوی کا ذکر سجتا

نہیں۔وہ ایک شریف عورت ہےاورتم......''

''اور میں بدنام...... بری......لوفر......رنڈی...... گشتی......ٹیکسی......سب کی جھوٹی موٹی معشوقہ ......''اس نے رک رک کر اپنے سارے نام گنوائے، انداز میں طنز کی دھار مزید تیکھی تھی۔

دیوتا کسی داسی کی زبان سے ہونے والے اس قدر گہرے وار کیسے سہہ سکتا ہے؟ یہ کیفیت شاہد کو مسلسل توڑ رہی تھی۔اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اس عورت کو بالوں سے پکڑے اور گھسیٹ کر باہر نکال دے، وہ چاہتا تھا کہ اپنی آواز کی دھمک سے اس کی تیکھی اور ترش باتوں کو دبا لے......لیکن یہ ممکن نہ تھا۔اسے تو اپنی آواز بھی کمرے میں سے باہر نکلتی محسوس ہوتی تو وہ دھیمی کر لیتا۔

بس اتنا کہہ سکا۔''مجھے تمہارے ساتھ کچھ نہیں کرنا، میرے پیسے واپس کرو اور دفع ہو جاؤ۔''

وہ کچھ دیر اس کے چہرے کو تکتی رہی اور پھر اپنا پرس اس کے سامنے کرتی ہوئی بولی ''لو......جتنے پیسے نکلتے ہیں نکال لو......''چہرے پر ایک سنجیدگی تھی اور آنکھوں میں غصے کی جھلک۔

شاہد نے اس کی طرف نہ دیکھا''خود نکال دو......''

'' بس اتنے ہی ہیں۔''نوشی نے پرس میں سے کچھ پیسے نکالے اور شاہد کے طرف بڑھا دیے۔کم پیسوں کو دیکھ کر شاہد نے کہا''یہ بھی نہیں چاہئیں۔''

''کیوں؟ کیوں کہ یہ ناپاک ہیں؟ رکھ لو......تم جیسے شریفوں کے پاس سے ہی ملے ہیں۔''

''کم از کم تمہیں شریف اور بے غیرت کا فرق تو پتہ ہے۔''شاہد کی نظروں میں ایک حقارت تھی۔

''ہاں، پتہ تو ہے......دن رات پالا پڑتا ہے...... بڑے بڑے آڑھتیوں سے لے کر سرکاری افسروں تک......ان پڑھوں سے...... پڑھے لکھوں سے...... زبان تو کھلتی ہے......اسی لیے پھر بری بھی لگتی ہے......کیوں کہ تمہاری بیویوں جیسی نہیں ہیں اور یہ بھی اچھا ہے کہ ہم ان جیسی نہیں ہیں۔کیوں کہ ہم کچھ دیر کے لیے اپنا جسم بیچتی ہیں۔اس کے بعد آزاد ہوتی ہیں۔ہم کسی بازار میں جائیں، کسی مرد سے آنکھ لڑائیں، ہنسیں کھیلیں ہمیں روکنے والا کوئی نہیں...... پر ایک

بات کہوں؟'' شاہد نے کوئی جواب نہ دیا تو وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی؛

''اصل ٹیکسیاں تو تمہاری بیویاں ہوتی ہیں''

شاہد ترش مزاجی کے ساتھ مخاطب ہوا؛

''میں نے کہا نا،تم یہاں سے جاسکتی ہو۔''

''میں نے کوئی جھوٹ تو نہیں کہا......وہ ٹیکسیاں ہی تو ہیں جو روٹی کپڑا مکان اور نام کی خاطر اپنا جسم بیچتی ہیں اور ساتھ اپنی مرضی بھی۔وہ تو سوتی جاگتی بھی تمہاری مرضی سے ہیں، باہر کی ہوا بھی تمہاری مرضی سے کھاتی ہیں...... ہم بیویاں نہیں ہیں......تمہاری مرضی ہم پر نہیں چلتی...... اسی لیے تو تم شریفوں کو اچھی نہیں لگتیں......'' دونوں کے بیچ میں کچھ پل کی خاموشی رہی اور وہ پھر مدھم سی آواز میں بولی

''ہماری......زندگی میں دکھ ہیں پر اتنے گِلے نہیں۔اتنا وقت ہنسنے میں گزر رہا ہے کچھ دیر کے لیے رو بھی لیا تو کیا ہوگیا......؟ ہنسنا ہو کہ رونا......اس میں مرضی تو اپنی ہے نا......

ویسے پتہ ہے کیا...... بیوی اور ٹیکسی...... دونوں ہی ٹوٹی پھوٹی اور خالی عورتیں ہیں......فرق بس اتنا ہے کہ ایک کو پوری عمر کے لیے ایک ہی مرد خرید لیتا ہے......اور مجھ جیسی روٹی کی خاطر روز بکتی ہے......''

یہ کہتے ہوئے کمرے کے سرد ماحول میں نوشی نے محسوس کیا کہ جلتا ہوا پانی کا ایک قطرہ اس کی آنکھ میں سے نکل کر گال پر آیا ہے، وہ مُسکرائی اور اپنی ہتھیلی سے رخسار خشک کیا۔

لفظ لفظ سے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے اندر بھرا غبار بیوی کا ذکر ہوتے ہی بے ترتیب ہو کر باہر نکلنے لگا ہے......ادھر شاہد کے چہرے سے بھی حقارت کے تاثرات ختم ہو چکے تھے، اُس نے کچھ کہنا چاہا لیکن نوشی نے اپنی بات جاری رکھی؛

''پر دل خوش ہوتا ہے جب کسی ایسی عورت کو دیکھتی ہوں جو ٹیکسی ہے نا بیوی......صرف عورت ہے...... اندر باہر سے......مکمل عورت...... نیچے سے اوپر تک......جس کا جسم خریدا جاتا ہے نا مرضی......''

نوشی دور کہیں خیالات کے بھنور میں ڈوب چکی تھی......آنکھیں سامنے دیوار پر جمی ہوئی تھیں، اُس ساعت کمرے کی ہر شے پر مکمل سکوت طاری ہو چکا تھا۔رات جیسی کہانی باز بھی اپنی

گہرائی بھول چکی تھی، اپنا اثر کھو چکی تھی......نوشی نے سرد آہ کے ساتھ ماحول کے سناٹے کو توڑا اور پرس اٹھاتے ہوئے بولی؛

''اور رکھ لو یہ پیسے...... ڈرومت...... پاک ہیں، صاف ہیں، اگر نوٹوں میں ہمارے گندے بلاؤز کی بد بو ہو بھی تو کون پہچانے گا......؟ وہی نا......جس نے ہمیں سُونگھ رکھا ہے......؟''

یہ کہہ کر اس نے آزاد، بیپر واہ لیکن کچھ کچھ جھوٹی ہنسی چہرے پر سجائی اور باہر کے دروازے کی جانب چلنے لگی۔

شاہد بھی اٹھ کھڑا ہوا نوشی کی طرف قدم بڑھایا، شاہد کا منہ اور باہر کا دروازہ ایک ساتھ کھلے مگر اس سے پہلے کہ کوئی لفظ اس کے منہ سے نکلتا، دروازہ زوردار آواز میں بولا ؛

''چُپ......!''

اُس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا اور اندر موجود سکے ایک ایک کر کے زمین پر گرنے لگے......

چھنکار سے خالی......

بے وزن......

اور کھوٹے سکّے ......

ببلی/ بابر

لکڑی کے فریم میں بڑا آئینہ لگا ہوا تھا، جس میں نیچے سے اوپر تک ایک لمبی دراڑ تھی جو کہ اُس کے عکس کو دو حصوں میں بانٹ رہی تھی۔ آنکھوں کا کاجل جو نمکین پانی کے ساتھ بہہ کر رخساروں پر کچھ کالی اور ٹیڑھی لکیریں چھوڑ گیا تھا، جب سُرخ ہونٹوں پر بائیں ہاتھ کی ہتھیلی رگڑی تو وہ لکیریں مٹ تو گئیں مگر سرخی پھیل گئی۔ لمبی لمبی پلکیں اتار کر چھوٹی سی ڈبیا میں رکھی اور گھنے کالے بالوں کو بھی سر سے اتار کر ایک طرف رکھ دیا۔ وہ ببلی سے بابر بن چُکا تھا۔ کچھ دیر اِسی ٹوٹے آئینے میں اپنی پیشانی سے لے کر ناف تک دو حصوں میں بٹے عکس کو دیکھتا رہا اور پھر قمیض اتار کر پیٹھ دیکھی جس پر لاٹھیوں کے نشان واضح تھے۔

وہ کچھ گھنٹے پہلے ایک شادی سے لوٹا تھا، جس پر جانے کے لیے تیار ہوتے اُسے اپنی ضرورتوں کے سمندر میں قطرہ شامل ہونے کی اُمید تھی، یہ اُمید ہر شادی سے پہلے جنم لیتی تھی۔

حالانکہ اُسے معلوم تھا کہ گرمی کی پوری رات ریشمی لباس پہن کر بغیر سانس لیے ناچنا پڑے گا، لوگوں کی رنگ برنگی باتیں سننا پڑیں گی، ہر طرح کی چھیڑ خانی کا بھی ہنس کر جواب دینا ہو گا، مگر بدلے میں جو پیسے ملیں گے اُن کے سامنے اِن عذابوں کی کیا اوقات تھی؟ لیکن ایسا ہوا کہاں۔ شادی کی محفل عروج پر تھی وہ ناچتا چلا جا رہا تھا، تمام لونڈوں نے شراب پی کر آسمان سر پر اُٹھا رکھا تھا، جب حد پار ہوئی تو خاندان کے کچھ بزرگ آ کر اُنہیں گالیاں بکنے لگے، ایک نے تو آؤ دیکھا نہ تاؤ اور ببلی پر لاٹھی لے کر برس پڑا، پیسے تو کیا ملنے تھے بمشکل جان بچا کر بھاگنا پڑا۔ بس گھر پہنچ کر تب سے اِس ٹوٹے آئینے کے سامنے بیٹھا اپنے خوابوں کی کرچیاں چُن رہا تھا اور ساتھ ہی اپنے زخموں کو سہلانے کی کوشش میں تھا۔

اب بھلا شادیاں اُس کی ساری ضرورتیں کیسے پورا کر دیتیں؟ ضرورتیں تھیں بھی تو بہت زیادہ۔ ماں کے گلے کا کینسر تو خیر اب اپنی موجودگی بھی بھول چکا تھا، سو بابر کو بھی اب اُس کی اتنی فکر نہ رہی۔ مگر سب سے زیادہ اُسے اپنی بہن کا جہیز (چار کُرسیاں ایک میز) پریشان کر رہا تھا جو پڑا پڑا دو مسہریوں کے انتظار میں دیمک زدہ ہو چکا تھا، اور وہ دو مسہریاں ابھی تک رشتے کے انتظار میں بنی ہی نہیں تھیں۔ ہاں! ایک اور بھی فکر تھی، روز کی روٹی۔

آنسو بدستور ٹپک رہے تھے، پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر آئینے کی ٹیڑھی سی دراڑ کو دو انگلیوں سے چُھوا، وہ دراڑ کبھی ختم نہیں ہو سکتی تھی۔ آئینہ جڑ سکتا تھا، ہموار ہو سکتا تھا۔ مگر اس کے عکس کو دو حصّوں میں تقسیم نہ کرتا یہ کہاں ممکن تھا؟ اس دراڑ کو چُھوتے ہی اس کے ذہن میں لاڈو کے کہے الفاظ ابھرے۔ ''ٹیڑھی لکیریں''

لاڈو اس کی گُرو تھی، ناچنا چھوڑ کر سگریٹ پان کا کھوکھا بنا لیا تھا۔ وہ خود کو قدرت کی کھینچی ٹیڑھی لکیر کا جزو کہتی تھی، نہ مرد نہ عورت! مگر دماغ بہت مکمل تھا۔ وہ کہتے ہیں ناوقت بہت بڑا استاد ہے......صرف گھنگھرو پہن کر ناچتی نہیں رہی تھی، بلکہ بہت کچھ سیکھتی سکھاتی بھی رہی۔

ہمارے ارد گرد دو طرح کے لوگ ہیں، ایک وہ جو اپنے گھر لڑکا پیدا ہونے پر خوشی محسوس کرتے ہیں اور لڑکی کے پیدا ہونے پر اداس ہو جاتے ہیں۔ ایک وہ جو لڑکے کی پیدائش پر بھی خوش ہوتے ہیں اور لڑکی کو بھی خدا کی رحمت کہہ کر گلے سے لگا لیتے ہیں۔ مگر ان دونوں کے درمیان میں کہیں ایک اور طبقہ بھی ہے...... جن کے گھر اولاد ہونے پر خوشی منائی جاتی ہے اور نہ خود کو تسلی دینے کے لیے کوئی لفظ ملتا ہے۔ وہ تو اس ننھی جان کے آتے ہی اس کا گلہ گھونٹنے کے بعد دفنا کر یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ ہمارے ہاں کچھ ہوا ہی نہیں۔

لاڈو بھی ایسے گھرانے میں پیدا ہوئی تھی۔ ماں باپ نے کچھ سال تو اسے چھپا کر رکھا مگر پھر ایک دن کئی ٹیڑھی لکیریں گلیاں گردانتے ان کی دہلیز پر آ کر واویلا کرنے لگیں۔ کیا ہو سکتا تھا، لاڈو کے لیے معاشرے نے جو جگہ مختص کر رکھی تھی اسے وہیں آنا پڑا۔ ماں باپ کی زندگی تک تو گھر آنے کی اجازت تھی، مگر ان کے بعد بھائیوں نے اپنے بچوں کے وقار کی خاطر اسے دھتکار دیا۔ اُسے اس گھر میں قدم رکھنے کے حق سے دستبردار کر دیا گیا جہاں اس نے آنکھ کھولی تھی اور پھر کبھی اُس نے بھی وہاں کا رخ نہ کیا۔

ڈھلتی عمر میں ریلوے اسٹیشن کے قریب ایک چھوٹا سا سگریٹ پان کا کھوکھا بنالیا۔ اکثر کہا کرتی تھی، کیا بُرا تھا اگر وہ مجھے بھی مکمل کر دیتا؟ آنکھیں دیں، کان دیا، ناک، منہ ہاتھ پیر...... ٹانگیں! جہاں پوری دنیا کو دریا دلی سے جنس بانٹ ہی رہا تھا تو ہم جیسوں پر آ کر کونسا کال پڑ گیا؟ مجھ میں کمی ہے، اس سے مجھے کوئی گلہ نہیں۔ چلو ادھورا چھوڑ دیا کوئی بات نہیں۔ پر اپنی باقی مخلوق کو تو پورا بناتا، انھیں کم از کم مکمل سمجھ تو دے دیتا، اتنا جاننے کے قابل تو بنا دیتا کہ ہم بھی اس کے بنائے لوگ ہیں...... دل اور دماغ رکھتے ہیں، جذبات ہم میں بھی پلتے ہیں۔ بارش ہمیں بھگوتے ہوئے بدکتی نہیں۔ ہوا ہمیں بھی چھوئے بغیر نہیں گزرتی۔ تو پھر یہ خدا کا بنایا انسان، دوسرے انسان سے جینے تک کا حق کیوں چھین لیتا ہے؟ کیوں ہنستا ہے؟ کیوں مذاق اڑاتا ہے؟ کیوں گھورتا ہے؟ ہمیں شادیوں پر نچاتے ہیں، تالیاں بجاتے ہیں، خوش ہوتے ہیں، دعائیں بھی کرواتے ہیں...... کچھ تو اپنی ہوس کی آگ بھی بجھاتے ہیں، عزت کرنا تو ایک طرف انسانوں کی گنتی میں بھی نہیں گنتے...... اصل ہیجڑا پن تو یہ ہے...... یہ ڈھیلے نالے (ازار بند) والی دنیا انسان کی شلوار میں جھانک کے ہی کیوں اُسے انسان ہونے کی سند دیتی ہے؟ قصور ہمارا تو نہیں، ہم تو قدرت کی کھینچی لکیریں ہیں۔ ٹیڑھی لکیریں ہی سہی......!

لاڈو قدرت سے بھلے جتنا بھی لڑ لے، کوس لے، خود کو اسی کی کھینچی ٹیڑھی لکیر کہے مگر...... اس کے باوجود وہ پوری عمر کی کمائی میں سے حج کر آئی تھی۔ اکثر ہنس کر کہا کرتی تھی کہ میں نہیں جانتی کہ خدا مجھے یہاں سنتا تھا کہ نہیں، سوچا میں مقدمہ لے کر اس کے گھر ہی جاؤں، کہ خدایا اتنی کنجوسی......؟

خیر...... رمضان و مُحرم کے فاقوں، لوگوں کی بداخلاق نظروں اور پھر غیرت مند بزرگوں کی بے رحم لاٹھیوں جیسی چیزوں کا سامنا کر کر کے بابر نے بلی کو خیر باد کہہ دینا ہی مناسب سمجھا۔ یہ بات پہلی بار اُس کے ذہن میں نہیں آئی تھی، بلکہ کئی مہینوں سے اِس پر سوچ رہا تھا لیکن ہمت نہ پڑتی۔ آج پھر جب لاڈو کی زندگی پر غور کیا تو اس کے خیالات کو اور تقویت ملی۔

وہ اپنے مالک مکان کے پاس پہنچا دروازے پہ دستک دی۔

''کون؟''

''الیاس بابو میں ہوں...... بابر...... ذرا باہر آنا!''

الیاس باہر آیا ''ہاں جی کیا بات ہے بھئی؟''
''آپ کو بتانے آیا ہوں کہ کمرہ چھوڑنے لگا ہوں'' بابر نے ڈھیلی سی آواز کے ساتھ نظریں جھُکا کر کہا۔
''کیوں؟ خیریت تو ہے نا؟ کہاں جا رہے ہو؟''
''آہو جی، بس اپنے گھر، یہ کام چھوڑنے لگا ہوں''
''ہوا کیا ہے؟''
''کچھ نہیں جی، بس کچھ نئیں رکھا اس کم میں''
''اچھا...... چلو مرضی تہاڈی، کوئی اور کرائے دار ہو تو بتانا''
''جی ٹھیک ہے''
''تہاڈی بڑی یاد ستاوے گی''الیاس نے مُسکراتے ہوئے بابر کی ناک اپنی شہادت کی انگلی سے چھوئی، بابر بھی بلبلیانہ انداز میں شرماتے ہوئے بولا''الیاس جی تُسی وی نا...... باز نہ آنڑاں......''
''جانا کب ہے؟''
''بس کل ہی''
جس سائیکل پر اُس کا باپ سبزی بیچا کرتا تھا، وہ چھ مہینے سے گھر کی دیوار کے سہارے پنکچر ٹائر لیے کھڑا تھا، اور باپ سائیکل کے پنکچر ہونے سے ڈیڑھ مہینہ پہلے جہانِ فانی سے کُوچ کر گیا تھا، اُس سائیکل کی مرمت کروانے کے بعد بابر نے سبزی منڈی جا کر کچھ سبزیاں خریدی اور سائیکل پر لاد کر بیچنے نکل پڑا۔ گلی کی نکڑ پر پہنچ کر آواز لگائی۔
''آلو...... ٹماٹر...... مرچاں...... اوہم اوہم......'' آواز قدرے ہلکی تھی، قہقہہ سنائی دیا مڑ کر دیکھا تو گلی میں کھڑے کچھ لڑکے ہنس رہے تھے، اُن میں سے ایک بولا:
''فیر بول...... فیر بول......''
اب بھلا بابر بننے کے فیصلے سے چال ڈھال یا ادائیں تو نہیں بدل جاتیں، بھلے وہ بابر بننے کی ٹھان چکا تھا مگر جو اُس وجود میں 'ببلی' رَچ بس چکی تھی اُس کا جانا اتنا آسان تو نہ تھا۔
سائیکل پر سوار ہوا، لڑکھڑاتے ہنڈل کو سنبھالتے ہوئے پوری قوت سے پیڈل مارنے

لگا۔ غصہ اور شرم پانی بن کر اُس کے ماتھے سے ٹپک رہا تھا۔ سوچا محلے سے کہیں دور جایا جائے۔ قدیمی محلے میں پہنچ کر سائیکل سے اترا، اِدھر اُدھر دیکھ کر آواز لگائی ابھی آدھی گلی ہی پار کی تھی کہ ایک عورت آئی

''ٹماٹر کس طرح لگائے ہیں؟''

''جی باجی صرف سٹھ روپے کلو''

عورت نے انداز دیکھا تو مُسکرا کر ڈوپٹے سے آدھا چہرہ ڈہانپ لیا'' پچاس کے لگالو اور ایک کلو دے دو''

اُس نے ٹماٹر تولنا شروع کر دیے، عورت دوبارہ بولی'' تم شادیوں پر بھی ناچتے ہونا؟''

بابر کے ہاتھ رک گئے۔ تھوڑی دیر عورت کی طرف دیکھا اور پھر ٹماٹر شاپنگ بیگ میں ڈالتے ہوئے بولا'' جی باجی......اب چھوڑ دیا ہے''

''مجھے یاد ہے تم میرے دیور کی شادی پر آئے تھے، لاہور والی بچیوں نے تمہارا ڈانس دیکھنے کے لیے تمہیں اندر بُلوایا تھا۔ اچھا کیا جو ناچنا چھوڑ دیا......محنت کر کے کماؤ۔''

بابر نے ٹماٹر دے کر پیسے لیے اور آگے چل پڑا'' ہونہہ...... ہر کوئی حاجی بنڑیا پھردا اے''

کچھ ہی گھنٹوں میں اُس نے بہت سی نگاہیں برداشت کیں اور بہت قہقہے سُنے۔ بہت جملے کسے گئے...... اُسے یوں لگ رہا تھا کہ وہ اپنے پیشے سے زیادہ ایک پھیری والا بن کر ذلت سہہ رہا ہے، ہر دوسری گلی میں کوئی نہ کوئی ایسا مل جاتا جو ببلی سے واقف ہوتا، ایسے میں سبزی تو خاک بیچنا تھی بھاگنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہتا۔

سورج ڈھل رہا تھا مگر سوچوں کے انبار تلے دبی اُس کی آواز کا باہر آنا ممکن نہیں رہا تھا، کمر میں لاٹھیوں کا درد دوبالا ہو چکا تھا، ٹانگیں جواب دیتی جا رہی تھیں، قمیض چھاتی، کمر اور بغلوں کی جگہ سے پسینے کے سبب جسم کے ساتھ چپکی ہوئی تھی، اُسے اس باریک لباس میں ریشمی لباس سے زیادہ اکتاہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ سائیکل کا ہینڈل تھامے پیدل چلتا جا رہا تھا، سمت کا نہیں پتہ، بس چلتا ہی جا رہا تھا۔

آواز آئی'' اوئے اوئے......ببلی بدماش توں شریف ہوگئی......''

اور ساتھ ہی بہت سارے قہقہے۔ اُس نے مُڑ کر نہ دیکھا، چُپ چاپ چلتا رہا۔ فقط

ہونٹ بُڑ بُڑائے'' کتے، حرامزادے''

پھر ایک اور آواز سُنائی دی'' اک کلوآ لو دے جاتے نال دو ٹھمکے وکھا جا......'' پھر وہی قہقہے، اُس نے اَن سُنی کر دی......

اتنے میں ایک لڑکا سائیکل پر سوار پاس سے گزرا، بابر کی سائیکل کو لات مار کر آگے نکل گیا......سائیکل زمین پر گرتے ہی ساری سبزیاں یہاں وہاں بکھر گئیں۔ پہلے سبزیوں کی طرف دیکھا پھر اُن لفنگے لڑکوں کی طرف اور مخصوص زنانہ انداز میں بولا'' ذلیلو......کتو......شرم تے نئیں آندی......'' جواب میں بے شمار قہقہے۔

وہ نیچے بیٹھ کر سبزیاں چُننے لگا، اور آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے......

دروازے پر دستک ہوئی، اندر سے آواز آئی'' کون؟......؟''

'' الیاس بابو میں ہوں......'بجلی'......ذرا باہر آئیں......کمرہ کرائے کے لیے خالی ہے نا؟ میں......میں کل واپس آ رہی ہوں......''

بارگاہِ خداوند

گاؤں کی دُھند ا میں لپٹی سسکتی رات بے کسی کا لحاف اوڑھے سورہی تھی اور 'سونا' بڑھاپے کے اندھیروں میں گم ہوتی بےثمر زندگی کا آخری کنارہ تھامے اپنے جائز ناجائز ہونے کی گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کر رہا تھا، پڑوسیوں کا لڑکا حسبِ معمول اپنے گھر سے لایا کھانا اور پانی رکھنے کے بعد کافی دیر تک بیٹھا رہا مگر سونے کی خاموشی کو دیکھ کر وہ بھی جا چکا تھا۔

سونے کی طبیعت شام ہی سے مضمحل تھی۔ ذہن جلتے بجھتے دیئے کی طرح ٹمٹا رہا تھا۔ ساعتیں گزرے دنوں کے بےحیثیت لمحوں کی آنچ پر جل رہی تھیں زندگی اگر ایک تحفہ تھی تو پھر کہیں جائز اور کہیں ناجائز کیوں تھی......؟

انہی خیالات کے دوران اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے دونوں پاؤں اور دونوں بازوؤں کو چمڑے کے پٹوں سے باندھ کر جائز اور ناجائز کے سینگوں والے دیو ہیکل جِن مخالف سمتوں میں کھینچ رہے ہیں اور اس کے ریشے دھاگہ دھاگہ ہو کر ٹوٹ رہے ہیں۔ اس کے دل میں خواہش ابھری کہ کاش وہ اسی درد و کرب کی کھینچا تانی میں ٹوٹ کر دو ٹکڑے ہو جائے اور معلوم ہو کہ اس کا وجود آخر ہے کیا؟ کیا جائز تھا اور کیا ناجائز؟ بوڑھے کانوں کے راستے بچپن کی گلیوں سے آتی کئی آوازیں اس کے دماغ کے گھڑیال بجانے لگیں۔

''یہ حرامی ہے۔ فاطی اور مرزے کا گناہ ہے۔ گاؤں کی بدنامی ہے۔ محلے کی بے غیرتی ہے۔ سونے حرامی، اوئے سونے حرامی، تیرا باپ کون ہے؟''

بہت سال پہلے ایسی ہی دھند میں لپٹی رات تھی جب سونے کی ماں فاطی اِسی نیم تاریک کمرے میں پھولے ہوئے پیٹ پر ہاتھ رکھے آنسو بہا رہی تھی کہ بی بی جی اندر آئیں۔ فاطی اٹھ

بیٹھی اور آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے دھیمی سی آواز میں بولی ؛

''بی بی جی......بسم اللہ...... مجھے بلا لیتیں، اتنی سردی میں کیوں تکلیف کی؟''

بی بی جی ایک طرف بچھی چارپائی پر بیٹھ گئیں اور کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولیں ؛

''فاطی ! تُو کیوں ضد پر اڑی ہوئی ہے؟ کس کس سے لڑے گی؟ سمجھتی کیوں نہیں؟ یہ ناجائز بچہ کیسے پالے گی؟ تجھے گاؤں والے نہیں جینے دیں گے......میری بچی اسے گرا دے۔ایک غلطی تو کر چکی ہے اب اسے جنم دے کر کیوں ساری زندگی کا عذاب مول لیتی ہے؟''

یہ کہنے کے بعد فاطی کی آنکھوں میں دیئے کی لو کی طرح تھرتھراتی التجاؤں کی روشنی دیکھ کر بی بی جی نے سر جھکا لیا۔

''بی بی جی یہ غلطی نہیں ہے۔ بالکل بھی غلطی نہیں......مرزا اور میں نے تو محبت کی ہے اور سچ تو یہ ہے بی بی جی کہ مجھے شمو کی شادی کرانے والے لوگ بے حیا اور گنہگار لگتے ہیں۔ بیچاری اپنی بارات پر رو رو کر کہہ رہی تھی مجھے یہ شادی نہیں کرنی، میں فضل کی ڈولی میں نہیں بیٹھوں گی۔آج اسی فضل کے چھ بچے پال رہی ہے...... وہ جائز کیسے ہو گئے؟''

فاطی کو سوال کا جواب نہ ملا تو وہ دوبارہ بولی "مرزا اور میں نے تو محبت کی ہے۔ سچی محبت......شادی بھی کر لیتے اگر فیکا اُس کا بیری نہ بنتا تو......"

بی بی جی نے سر اٹھا کر فاطی کی طرف دیکھا اور بولیں ؛

''فیکے کا بیر جائز ہے۔ تیرے تائے کا بیٹا ہے اور تیرے مرے ہوئے شوہر کا بھائی بھی۔تُو شکر کر کہ چھوٹے چودھری نے مرزے کو راتوں رات بھگا دیا، ورنہ کیا کا کیا ہو جاتا۔اور فیکا تو تجھے بھی جان سے مار دیتا۔اس کی خاموشی صرف میری وجہ سے ہے۔دیکھا نہیں تھا کیسے غصے میں بھرا ہوا آیا تھا...... کیسے بول رہا تھا...... میں نے سختی سے ڈانٹا تو سر جھکا کر پلٹ گیا۔عزت کرتا ہے میری، مجھے اپنی ماں سے زیادہ اہمیت دیتا ہے، اسے قرآن پڑھاتی رہی ہوں۔لیکن فاطی بات بہت الجھ گئی ہے، خدا جانے ٹلے گی بھی کہ نہیں''

کچھ دیر کے لیے کمرے میں خاموشی رہی، پھر بی بی جی کی آواز نے اس خاموشی کو توڑا ؛

''مرزے کو بھگا دینا ٹھیک نہیں لگتا۔ چپکے سے شادی ہو جاتی۔مگر فیکے کی آنکھوں میں اترا خون دیکھ کر کوئی اور حل بھی تو نہیں نظر آیا۔شاید چھوٹے چودھری نے اسے واپس نہ آنے کی

دھمکی دے کر صحیح فیصلہ کیا، ورنہ فیکے نے مرزے کو یا تم دونوں کو قتل کر دینا تھا۔ سارے لوگ تو اسے بے غیرتی کا طعنہ دے کر بھڑکا رہے تھے۔ اندھے جذبات میں بہہ کر آدمی کسی وقت کچھ بھی کر سکتا ہے۔ مگر یہ بچہ اب سب کے لیے مسئلہ بن گیا ہے۔ میں کس کس سے لڑوں گی؟ تُو کس کس کو صفائیاں دے گی؟ پاگل مت بن، اس بچے کو جانے دے۔''

فاطی لکڑی کے دروازے کی طرف دیکھ کر کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی، آنکھیں دروازے پر اٹکی رہیں ہونٹ گویا ہوئے؛" میری زندگی آپ سب کے سامنے ہے بی بی جی۔ ایک بار شادی ہوئی تو بیوہ ہوگئی۔ اس کے بعد میں نے کسی مرد کی طرف سر اٹھا کر نہ دیکھا تھا۔ مرزا آیا تو میرا بہت خیال رکھنے لگا۔ چھوٹی موٹی چیزیں، چھلے پراندے ریڑھی بازار سے میرے لیے خرید لاتا تھا۔ میں بھی گھر سے اپنے حصے کی مٹھائی کھانے پینے کی چیزیں لاتی تو دونوں مل کر کھا لیتے۔ یہی کافی تھا، زیادہ کا کبھی سوچا نہ تھا۔ میں دل سے اس سچے اور کھرے انسان کی ہوگئی تھی......شادی کے خواب پورے نہیں ہو سکے تھے کہ اس بچے نے میرے اندر ہونے کا پتہ دیا...... کس سے کہتی؟ جس کسی پر یقین کر کے اپنی بات بتائی، وہ سنتے ہی ڈر گئے، انھیں اپنی اپنی فکر پڑ گئی...... کہیں میرے ساتھ واسطہ ان کے اپنے ہنستے بستے گھر نہ اجاڑ دے۔

''ان پڑھ ہوں۔ قرآن سنت سر آنکھوں پر، مگر بی بی جی اوپر والے نے اس میں روح اس لیے ڈالی کہ ہم سب اسے مار دیں۔''

فاطی کے لہجے میں ایک کرب بھر چکا تھا وہ اُس رات بضد رہی۔ کہہ رہی تھی، محبت تو انسان کو مکمل کرتی ہے، گناہ ادھورے لوگ کرتے ہیں۔ یہ بچہ گناہ یا کوئی غلطی نہیں، میں اسے پال پوس لوں گی۔ اسی کے سہارے جی لوں گی، مجھے بے آسرا نہ کریں بی بی جی۔ آپ نے بہت احسان کیے ہیں، ایک اور کر دیں، پوری زندگی نہیں بھولوں گی۔ اس بچے کو جنم لینے دیں۔ گاؤں والوں کا منہ بند کروا دیں۔ مرزا آئے گا تو ہم شادی کر لیں گے۔ اگر اس بچے کو مارنا ہی ہے تو ساتھ مجھے بھی مار دیں۔ بے شک زہر دے دیں۔ اس کے جذبات میں تلاطم تھا۔ بی بی جی بھی ماں کا درد محسوس کر رہی تھیں، الفاظ کم پڑ رہے تھے۔ کمرے میں دوبارہ مکمل خاموشی اُتر چکی تھی۔

بی بی جی نے فاطی کو دوسرے گاؤں اپنے بھائی کے گھر بھیج کر بچے کے امکان کو حوصلہ تو دے دیا۔ لیکن مرزے کا کئی سال بیت جانے کے بعد بھی پتہ نہ چل سکا۔ اور نہ ہی کبھی کسی نے فیکے

کو دیکھا۔ مگر فاطی جانتی تھی کہ مرزا بے وفا نہیں تھا، زندہ ہوتا تو ضرور پلٹ کر آتا...... اس نے سونے کو اپنی محبت کا حاصل سمجھ کر گلے سے لگائے رکھا۔

بہت سال بیت جانے کے بعد آج نجانے کیوں اسی نیم تاریک کچے کمرے کے سناٹے میں ماضی کی آوازیں گونجنے لگی تھیں۔ دیواروں پر تصویریں بنتیں کبھی بگڑتیں۔ سونے کے اندر ایک عجیب سی بے چینی جنم لے چکی تھی۔ کیا عمر کے اس حصے میں پہنچ کر آخرت کا ڈر اس کے وجود کی شناخت مانگ رہا تھا؟ یا پھر خدا کی بارگاہ میں اسے کسی اور جواب کی تلاش تھی؟

اسے یاد آنے لگا تھا کہ سارا گاؤں جہاں اس پر جملے کستا تھا وہاں ایک واحد سہارا اماں تھی۔ وہ اسے اپنے سینے کے ساتھ لگا لیتی، ماتھا چومتی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ لیے بہت دھیمی سی آواز میں کہتی ''سونے، تُو تو میری جان ہے۔ میرا دین ایمان...... سب کچھ۔ کون کہتا ہے تُو حرامی ہے؟ تُو مرزے اور میری محبت کی نشانی ہے۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو قبول کیا تھا۔ بھلا پیار محبت کے لیے کسی کاغذ پرچی کی ضرورت ہوتی ہے؟ تو میرا بیٹا ہے میں تیری ماں ہوں ہم دونوں ایک دوسرے کی دنیا ہیں، کیا یہ سچ نہیں؟ اس کے لیے بھی گواہوں کی ضرورت ہے؟''

ماتا کے میٹھے بول کچھ ایسا رس گھولتے تھے کہ سونے کے سارے دکھ درد اس کے مساموں کے راستے نکل جاتے اور اس کا بوجھل دل ہلکا ہو جاتا...... ایسا محسوس ہوتا کہ جیسے اس کے سوا محبت کا وجود کہیں نہیں اور لوگ...... یہ لوگ تو اس کے نزدیک کسی بنجر زمین میں کھارے پانی کے بدبودار جوہڑ ہیں۔

اس نے بے چین ہو کر کروٹ لی اور منہ دیوار کی طرف کر لیا۔ بوسیدہ لباس سے گزرتی سردی کی لہر اس کے وجود کو سن کرنے لگی تھی...... بند ہوتے پپوٹوں کے سامنے موجود دیوار دھواں بن کر تحلیل ہو گئی اور دور کہیں کسی گمنام قبرستان سے اس کی ماں کی کہی سنی باتیں پھر سے خود کو دہرانے لگیں۔

''سونے تیری تو شادی بھی نہ کر سکی۔ تجھے اس دنیا میں لا کر میں نے کوئی غلطی تو نہیں کر دی؟''

''نہیں۔ کوئی غلطی نہیں کی۔ تُو ایسا کیوں کہتی ہے؟ پہلے کبھی ایسا نہیں کہا۔ اپنے پیار سے میرا حوصلہ بڑھاتی آئی ہے اور اب کیوں ایسی باتیں کر رہی ہے۔''

''تُو جانتا ہے تیرا نام سونا کیوں رکھا......؟ مرزے کے جانے سے پہلے میں نے اس

کے ماں باپ کا نام پوچھ لیا تھا، ماں کا نام ممتاز اور باپ کا نام سونا خان بتایا تھا...... بیٹی ہوتی تو ممتاز ہوتی، تو ہوا تو مجھے سونا مل گیا۔' اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ ''پر سونے تجھے دنیا نے بہت ستایا ہے......''

سونا بیزار ہو کر اٹھ بیٹھا......اَن کہے، اَن سمجھے خیال اظہار مانگنے لگے...... کہ جیسے کچھ اس ترتیب میں نکلنے کو بے تاب ہوں؛

''کاش یہ خدا کی دنیا بھی مجھ سے میری ماں جتنا پیار کر سکتی......''

لیکن ایسا کچھ کہا نہ گیا......ہونٹوں نے کچھ ایسے الفاظ کو آزاد کیا؛

''کیا خدا کا پیار میرے لیے بھی ستر ماؤں جتنا ہے......؟''

''ہاں......تو اس نے اپنے بندوں کو بتایا کیوں نہیں کہ میں بھی ان جیسا بندہ ہوں؟''

رات اُس کے اعصاب پر بھاری ہو چکی تھی۔ خیالات کا الاؤ جل رہا تھا۔ جسم بے جان ہونے لگا تھا۔ آنکھوں میں اس ناجائز دنیا کا غبار بھر چکا تھا کہ اتنے میں فجر کی اذان ہوئی۔ وہ لحاف سے باہر نکلا اور قریب پڑی لاٹھی تھام کر آہستہ آہستہ پاؤں گھسیٹتا خدا کی دہلیز تک پہنچ گیا۔ رک کر ایک نظر گنبد کو دیکھا اور پھر اپنا بایاں پاؤں آگے بڑھایا۔ کچھ سوچتے ہوئے اس پاؤں کو واپس زمین پر رکھا اور دایاں پاؤں مسجد کے اندر رکھ کر آگے داخل ہوا۔ مولوی صاحب اذان دے کر فارغ ہو چکے تھے، انھوں نے کن اکھیوں سے سونے کو آتے دیکھا تو اپنا رومال سر پر درست کرتے کرتے مصلے پر بیٹھ گئے۔ سونا ان کے قریب پہنچ کر بولا ''سلام لیکم مولوی جی''

جواب میں مولوی صاحب کی معمولی سی آواز ابھری ''والیکم''

سونا گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر مولوی صاحب کے سامنے بیٹھ گیا۔

''مولوی جی۔......ایک بات پوچھنی تھی۔''

''کیا بات؟'' مولوی جی نے اپنا دامن جھاڑا۔

سونے نے کچھ پل مولوی صاحب کے چہرے کو دیکھا اور پھر اپنی گردن جھکا کر کہنے لگا۔ ''مولوی صاحب...... پوچھنا تھا کہ......آپ تو سب جانتے ہیں، میں جائز نہیں ہوں''

یہ کہہ کر سونا اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگا اور پھر کچھ دیر کے بعد دوبارہ بولا ''زندگی کا کچھ پتہ نہیں۔ ایک کمرے کا گھر ہے، اسے بیچ کر حج کرنا چاہتا ہوں۔ مکّے جانا چاہتا ہوں...... کچھ باتیں کرنی ہیں......مولوی صاحب میرا حج قبول ہوگا......کہ نہیں؟ یا خدا بھی اپنے بندوں کی طرح مجھ پر

لعنت بھیجے گا؟''

سونے کی آواز آخری الفاظ پر آکر بھرا گئی تھی...... وہ کچھ دیر کے لیے بالکل خاموش ہو گیا...... آنکھیں بند تھیں...... آنسو رواں تھے، کچھ توقف کیا کوئی جواب نہ ملا، اس نے جھجکتے ہوئے سر اٹھا کر دیکھا......تو سامنے کوئی نہ تھا،مولوی صاحب جا چکے تھے۔

خدا کا گھر تھا۔

وہ تھا۔

اور وہ تنہا تھا۔

چاکلیٹ......!

گلیوں میں رات اترتے ہی ہم تو گہری نیند سو جاتے ہیں......ہم......ہم بیچارے تھکن سے چُور نیند کے مارے، بے خبر اور بہرے کچھ نہیں جانتے، یہ بھی نہیں کہ......اس رات کے سنّاٹے میں کتنی کہانیاں سسکیاں بھرتی ہیں۔

میں اپنے اندھیرے کمرے میں لیٹا ہوا تھا، لائٹ نہ ہونے کی وجہ سے کپڑے پسینے سے بھیگے ہوئے تھے۔حکومت کو ایک موٹی سی گالی بک کر اٹھا اور گلی میں نکل آیا۔رات کے سوا دو بج رہے تھے، میں ٹہلتا ٹہلتا اپنے ٹاؤن کی مین اینٹرس پر پہنچ گیا جہاں ایک چوکیدار سگریٹ سُلگائے کرسی پر بیٹھا تھا۔میں عموماً دفتر سے رات گئے ہی گھر واپس آتا ہوں اور ہر بار مین اینٹرس پر یہی چوکیدار با آواز بلند کہتا ہے''سلام لیکم صاب جی''میں بس جھوٹی سی مسکان ہونٹوں پر لا کر سر ہلا کر گزر جاتا ہوں۔

میں نے چوکیدار کے سگریٹ کو دیکھ کر اپنی جیب میں سے پیکٹ نکالا ماچس کے لئے جیب ٹٹولی تو معلوم پڑا کہ ماچس گھر ہی چھوڑ آیا ہوں،''چوکیدار سے لیتا ہوں''اسی خیال کے ساتھ میں اس کی طرف بڑھا چند قدم کے فاصلے پر ہی تھا کہ اس نے کہا''سلام لیکم صاب جی''، خلاف معمول میں نے اپنے منہ پر اخلاق کا''لیپا''کیا اور اس سے زیادہ اچھے انداز میں جواب دیا ''وا......علیکم السلام......''

''ماچس ہوگی آپ کے پاس؟''

''جی جی، ماچسیں دو دو ہیں صاب جی، لیں''اس نے ماچس میری طرف بڑھائی۔

میں نے منہ میں سگریٹ لیا اور دیا سلائی لگائی، سگریٹ الٹا منہ میں رکھا تھا، فلٹر کو آگ لگی اور میرا اکلوتا سگریٹ بیکار ہوگیا، میں نے خالی پیکٹ ایک طرف پھینک دیا۔ یہ دیکھتے ہی چوکیدار بولا ''صاب جی، یہ کیا ہوگیا؟''

''الٹا لگا لیا تھا، فلٹر جلا ہے'' میں نے سگریٹ بھی ایک طرف پھینکتے ہوئے جواب دیا۔

''صاب جی، میرے پاس غریبوں والی سگریٹ ہے، گولڈ فلیک! سُوٹا لگانا ہے تو اس کا لگا لیں'' چوکیدار نے بہت ہی سادہ مگر مخلص انداز میں اپنے سگریٹ آگے کیے

میں ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا ''گولڈ فلیک......؟ اچھا چلیں دے دیں یہی''

''گولڈ لیف کے ڈنڈے میرا بھائی انگلنڈ سے لایا تھا، مجھ سے نہیں پیئے گئے، گلے کو پکڑ لیتی ہے'' میں نے اس بات کو چوکیدار کا سفید جھوٹ ہی جانا، جی میں سوچا ''لوگ یہاں سے انگلینڈ لے کر جاتے ہیں اس کا بھائی وہاں سے پاکستان لایا تھا۔''

پھر وہ اپنی کرسی کے ساتھ پڑی ایک اور کرسی کو سیدھا کرتے ہوئے بولا ''صاب جی بیٹھ جائیں'' میں بیٹھ گیا۔

آپ کا واسطہ اس طبقے کے کسی بھی شخص سے پڑے تو آپ کو چند ایک باتیں ہی سننے کو ملتی ہیں جیسے کہ ملکی بدحالی، غربت اور مہنگائی، لوڈ شیڈنگ، حکومت کی بری کارکردگی وغیرہ......سو اس کی گفتگو بھی ان ہی میں سے ایک پر شروع ہوئی۔

''بجلی نے تو برا حال کر دیا ہے، تین تین گھنٹے نہیں ہوتی۔ رات کی ڈیوٹی کر کے گھر جاتا ہوں تو دن کو بجلی کی وجہ سے نیند نہیں آتی، اتنی گرمی میں لوگوں کا برا حال ہے'' وہ کبھی میری طرف دیکھتا کبھی ادھر ادھر۔

یہ سب سن سن کر بہت پک چکا ہوں سو میں نے باتوں کا رخ بدلا ''کتنے سال سے یہ کام کر رہے ہیں؟''

''او جی بس...... پہلے فوج میں تھا تو بیمار ہوگیا نوکری چھوڑ دی جب ٹھیک ہوا تو یہاں گارڈ کی نوکری کر لی۔ پانچ سال ہوگئے ہیں......ساڑے پانچ پونے چھ سال''

''اچھا...... بہت عرصہ ہوتا ہے، بہت ہمت کی بات ہے ایسے پوری پوری رات بیٹھے رہنا۔ تھکن تو ایک طرف، ان حالات میں ویسے ہی کوئی نقصان پہنچا سکتا ہے......'' میں نے خدشہ

ظاہر کیا، مگر وہ اس کے جواب میں مسکرا دیا۔ میں دوبارہ بولا ''کبھی کوئی عجیب وغریب واقعہ ہوا ہو، حیران کر دینے والا؟''

''عجیب واقعہ......؟ کون سا عجیب واقعہ؟ کوئی نہیں جی'' اس نے اسی طرح مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''کوئی تو ہوا ہوگا۔ انسان کے اردگرد بہت کچھ ہوتا ہے، کہیں پر ظلم ہے، زیادتی ہے، بھوک ہے، چوری ہے، حق تلفی ہے، جہالت ہے۔'' میں نے بات کو طول دیا

دراصل میرے سے بڑا احمق کوئی نہیں، یہ بھی نہیں سوچا کہ بھلا اسے ان باتوں سے کیا مطلب؟ مگر اس کے باوجود یہ مزدور طبقہ اتنا بہادر ہے کہ ہر قسم کی بات بغور سنتا ہے، چاہے اس کی سمجھ آئے نہ آئے، اثر ہو نہ ہو۔

میں دوبارہ بولا ''کوئی واقعہ تو ایسا ہوگا۔ جس پر بڑی حیرت ہوئی ہو، حیرانی ہوئی ہو؟''

وہ بولا ''جی جی...... ہوتی تو ہے، مگر ابھی یاد نہیں'' اس نے آخری کش لگا کر سگریٹ ایک طرف پھینکا اور سوچ میں پڑ گیا ''کوئی......حیریانی......ہاں !ایک دفعہ''

''ہاں کیا ایک دفعہ؟'' میں تھوڑا سیدھا ہو کر بیٹھا۔ کیوں کہ وہ ایک چوکیدار تھا اور مجھے اس سے کسی بہت ہی حیران کن قصے کی امید تھی، جیسے کسی چور کو رنگے ہاتھ پکڑ لیا گیا۔ کوئی عاشق اپنی معشوقہ کی دیوار پھلانگتا ہوا پکڑا گیا۔ یا کوئی ہمسایہ چوری چھپے اپنی پڑوسن کے گھر گھستا ہوا دھر لیا گیا......کچھ ایسا......مگر اس نے کوئی اور ہی کہانی سنائی......

''میرے نا صاب جی پانچ بچے تھے، تیسرے نمبر والے کو ڈیڑھ سال پہلے نمونیا ہو گیا تھا، وہ چار سال کا تھا''

''اچھا؟ اوہو...... بہت برا ہوا۔ مگر اس میں حیرانی والی یا حیرت کی کیا بات ہے؟'' میں نے پوچھا

اس نے کچھ پل بہت ہی سنجیدگی سے میری طرف دیکھا، پھر بولا ''پہلے تو میری گھر والی گھر میں ہی ٹوٹکے کرتی رہی، کوئی فرق نہیں پڑا تو میں دم درود کرواتا رہا، وہ اور بیمار ہو گیا تو سوچا ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں، سرکاری ہسپتال میں رش اتنا تھا باری بڑی دیر کے بعد آئی، کمرے میں گیا تو ڈاکٹر صاب کو دیکھا۔ اسی ٹاؤن کے ہیں روز یہاں سے گزرتے ہیں، آپ جانتے ہوں

گے ڈاکٹر آفتاب کو؟''

میں نے 'ناں' میں سر ہلایا ''نہیں میں نہیں جانتا، اچھا پھر؟''

اس نے اپنی بات جاری رکھی ''اس دن ہسپتال میں ڈاکٹر صاب کے ساتھ میرے بیٹے جتنی ان کی بیٹی بھی تھی۔ وہ کچھ کھا نہیں رہی تھی اور ڈاکٹر صاب اسے پیار سے کھلانے کے لئے منا رہے تھے۔ بہت دیر کے بعد وہ بسکٹ کھانے لگی تو ڈاکٹر صاب بولے ہاں جی؟ کیا ہوا تمھیں؟ میں نے کہا ڈاکٹر صاب میرا بیٹا ہے، میری بات پوری نہیں ہوئی تھی ان کی بچی نے پھر انہیں کھینچا اور بولی پاپا چاکلیٹ...... زیادہ شور مچایا تو ڈاکٹر صاب اٹھ کر باہر چلے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد واپس آئے تو تب بھی بچی شور ہی کر رہی تھی۔ پاپا چاکلیٹ...... پاپا چاکلیٹ...... ڈاکٹر صاب بولے بیٹا ابھی تھوڑی دیر تک آ جاتی ہیں۔ پھر میری طرف ہو کر بولے اچھا تو کیا ہے؟ بیمار آپ ہیں یا بچہ؟ میں نے کہا میرا بچہ ہے جی۔ ڈاکٹر صاب نے پوچھا کیا ہوا ہے اسے؟ میں بتانے لگا تو ان کی بچی پھر بولی پاپا چاکلیٹ، ڈاکٹر صاب بولے بیٹا ابھی آتی ہے، بس ٹین منٹ......بس ٹین منٹ......'' چوکیدار کی نظریں سامنے آہنی کھمبے پر جمی ہوئی تھیں، وہ خاموش ہو گیا۔

میں کچھ دیر کے بعد بولا ''اچھا......پھر چیک کروایا تو؟''

ایک جھٹکے سے چوکیدار کی نظریں کھنبے سے اتر کر میرے چہرے پر آئیں ''ہیں......؟ جی جی......ڈاکٹر صاب کی بچی بہت ضدی تھی، جب تک چاکلیٹ آئی نہیں وہ مانگتی ہی رہی اور ڈاکٹر صاب بیٹی سے بہت پیار کرتے تھے۔ اس کو مناتے مناتے انہوں نے مجھ سے بیماری کا پوچھا، کچھ بچی نے سننے دیا کچھ نہیں سننے دیا، میں نے کہا ڈاکٹر صاب اسے کھانسی ہے، بخار ہے اور سینے میں درد بھی ہوتا ہے...... ڈاکٹر صاب کی بچی بہت شور مچا رہی تھی، انہوں نے پوچھا بخار کب سے ہے؟ اور مجھے تھوڑا سا ڈانٹ بھی دیا، مجھے کہتے تم لوگ بچوں کا خیال نہیں رکھتے، سردی میں چھوڑ دیا ہوگا۔ پھر انہوں نے منہ میں جلدی سے بخار دیکھنے والا آلہ ڈالا۔ تھوڑی دیر کے بعد اسے دیکھا، جلدی جلدی پرچی پر دوائی لکھی اور کہا صبح دوپہر شام دے دینا۔ کوئی باہر سے ان کی بچی کی چاکلیٹ لے کر آ گیا اور ڈاکٹر صاب اسے پیکٹ کھول کر دینے لگ گئے۔ میں اٹھ کر آ گیا۔''

چوکیدار نے دوسرا سگریٹ سلگایا اور ڈبیا میری طرف بڑھا دی، میں نے بھی ایک سگریٹ نکال کر سلگا لیا اور بولا ''اچھا پھر۔''

''پھر کیا صاب جی......دوائی لی، اگلی رات کواس کی طبیعت زیادہ خراب ہوگئی، ہسپتال لے کر بھاگے نہ کوئی رشکہ، نہ کوئی سیکل...... بچہ اوکھے اوکھے سانس لے رہا تھا، دوگڈی والوں کو ہاتھ دیا وہ بھی نہیں رکے......بس پھراسی رات میرا بچہ مر گیا......'' چوکیدار نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور سگریٹ کا کش لگایا۔

میں تھوڑی دیر چپ رہا پھر بولا ''ڈاکٹر آفتاب کے گھر کا پتہ تھا تو گھر لے جاتے، یا تمہارا گھر اس کے گھر سے دور تھا؟''

''اوہ نہ صاب جی کہاں دور ہے، ٹاؤن کے پارلی طرف میرا گھر ہے، میں لے کر آیا تھا، ڈاکٹر صاب کی بیوی نے کہا تھا گھر کوئی نہیں ہے...... پتہ نہیں اللہ ہی جانے، گڈی تو ان کی اندر کھڑی تھی''

میں اور چوکیدار کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے اور پھر میں اٹھ کھڑا ہوا۔

''جاتے ہیں صاب جی؟'' چوکیدار بولا

''ہاں، بس چلوں......سگریٹ کے لئے شکریہ''

''اوہ نہیں جی، کوئی بڑی بات نہیں۔ اور لے جائیں آگے رات ہے کہیں سے ملے گی نہیں''

''نہیں بس چلتا ہوں، شکریہ'' میں ہاتھ ملا کر اپنے گھر کی طرف آ گیا۔

اگلے روز میں کچھ جلدی آفس سے لوٹ کر گھر آ رہا تھا، مین اینٹرس پر میرے سے پہلے ایک گاڑی داخل ہو رہی تھی جس پر ڈاکٹر والا مونوگرام لگا ہوا تھا اور چوکیدار بہت ہی خوش اخلاقی سے، دایاں ہاتھ پیشانی پر رکھے، سر جھکا کر اونچی آواز میں اندر بیٹھے شخص سے کہہ رہا تھا؛

''سلام لیکم صاب جی......!''

برہنہ عورت

میرے خیال کی ڈائری کے دو ورق

10 دسمبر 2014ء

یہ سرد شام ہے، میں اپنے صحن میں چہل قدمی کر رہا ہوں۔ سورج میری سوچ کی طرح ڈوب رہا ہے، میری ماں کچھ دور سے آتی ہوئی دکھائی دی ہیں، ان کے ہاتھ میں سیب کے دو ٹکڑے ہیں جو میرے بارہا انکار کرنے کے باوجود ہاتھ میں تھما کر چلی گئی ہیں۔

کبھی کبھی میں ایسے وجود کو دیکھتا ہوں جسے ہم "ماں " کہتے ہیں تو مجھے یہ مکمل ایک نظام لگتا ہے۔ ہماری سوچ کا نظام، ہماری نفسیات کا نظام، ہمارے گھر کا نظام اور ہمارے معاشرے کا نظام......اپنے آپ میں مکمل اور منظم......

خیر، میں نے سیب کے دو لال ٹکڑوں میں سے ایک کے اندر اپنے دانت اتارے ہیں، دوسرے کو دیکھ رہا ہوں جو بہت زیادہ لال ہے...... یہ لال رنگ محبت کی علامت ہے۔ لیکن میں اسے درست نہیں سمجھتا، ہوسکتا ہے کہ یہ شدت کی علامت ہو کیونکہ محبت کی عکاسی کوئی رنگ نہیں کر سکتا۔ ہاں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ خون کا رنگ لال ہے اسی وجہ سے اس رنگ کو شدت ظاہر کرنے کے لیے محبت کے ساتھ منسوب کیا جاتا ہے۔ شدت کی علامت......دیوانگی کی علامت......

ڈوبتا سورج...... شدت...... دیوانگی...... ماں......محبت...... ان تمام چیزوں کے بارے میں سوچتے ہوئے میرے ذہن میں اُس عورت کا تصور ابھر رہا ہے جو میرے علاقے میں ایک عرصہ ہوا لباس کی پرواہ کیے بغیر بازاروں میں گھوم رہی ہوتی ہے۔ تیز تیز چلتی ہے۔ لوگوں پر

چلاتی ہے، بہت سال بیت چکے ہیں اب تو اس کے بال آپس میں کچھ اس طرح سے گتھ چکے ہیں کہ چمڑے کے ٹکڑے ایسے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کا رنگ جھلس چکا ہے، آنکھیں بجھی ہوئی ہیں۔ چھاتیاں ڈھلک کر غائب ہو چکی ہیں اور پاؤں کسی کچرے کا حصہ لگتے ہیں۔ میں آج تک سمجھنے سے قاصر رہا ہوں کہ آخر وہ لوگوں سے چلا چلا کر کہتی کیا ہے؟

کوئی کچھ دیتا ہے تو کھا لیتی ہے ایسے ہی پانی کوئی پلا دے تو پی لیتی ہے۔ کسی سے بھیک نہیں مانگتی...... چوک چوراہے کے بیچ بیٹھ کر پیشاب کرنے لگتی ہے۔ اس کے بدن پر صرف ایک قمیض ہوتی ہے جو اسے گھٹنوں تک ڈھانپ کر رکھتی ہے، شلوار نہیں پہنتی۔ اسے یوں برہنہ دیکھ کر کئی لوگ نظر چُراتے ہیں اور کچھ تو جی ہی جی میں اسے بے ہودگی بھی کہتے ہوں گے۔ میرے خیال سے یہ وہی لوگ سمجھتے ہوں گے کہ جو دیوانگی کی حد سے ناواقف ہیں۔ شاید وہ نہیں جانتے کہ شرم، حیا، غیرت، عزت، وقار، عظمت اور دیگر اخلاقیات صرف شعور کے ساتھ ہی وابستہ ہیں۔ جہاں شعور نہیں ہوگا وہاں کسی قسم کے اخلاقیات کی توقع کیسے کی جا سکتی ہے؟

لیکن ایک بات عجیب ہے، وہ عورت بھلے بھوک سے واقف نہیں ہے، پیاس کو محسوس نہیں کر سکتی، اپنے جسم کا بھی بالکل خیال نہیں رکھتی...... سارا دن جہاں کہیں بھی گھومتی رہے، ٹھیک دو بجے علاقے کے سکول کی چھٹی ہوتے ہی سکول کے گیٹ کی جانب بھاگنے لگتی ہے۔ کئی بچے اسے اپنی طرف بھاگتے دیکھ کر خوف زدہ ہو جاتے ہیں، کئی اسے تماشہ سمجھ کر ہنسنے لگتے ہیں اور کئی بچاؤ کی خاطر پتھر اٹھا کر اسے ڈرا کر پرے ہٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ نجانے کیا کہتی ہے...... کیوں چیختی ہے...... دیوانگی اس قدر بڑھ کیوں جاتی ہے...... میں نہیں جانتا...... کوئی بھی نہیں جانتا۔

میں حیران ہوں کہ شعور نہ ہو تو کسی چیز کا خیال نہیں رہتا، اس کا بھی کچھ ایسا حال ہی ہے مگر...... سکول کی چھٹی کا وقت اسے کیسے یاد ہے؟ میں نے کئی مرتبہ چاہا کہ میں کسی سے اس کی دیوانگی کا سبب پوچھوں، لیکن کسی کے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔ سچ پوچھئے تو میرے پاس اتنا وقت بھی نہیں ہے کہ میں پہلے اس کے گھر والوں کو ڈھونڈوں اور پھر وجہ پوچھوں۔

لیکن مجھے اس عورت کو دیکھ کر گھٹن سی ضرور محسوس ہوتی ہے، مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے پورے کا پورا معاشرہ غیر منظّم سا ہو گیا ہے...... جیسے کچھ ہو چکا ہے...... یا ہونے والا ہے...... جیسے...... جیسے چیزوں کی ترتیب الٹ دی گئی ہے...... جیسے کچھ توڑ دیا گیا ہے اور دوبارہ جڑ نہیں

پائے گا...... ناقابلِ بیاں ہے یہ الجھن...... شاید میں عورت کو ایک وجود سمجھنے کے ساتھ ساتھ باقاعدہ ایک نظام بھی مانتا ہوں...... ہوسکتا ہے کہ یہی وجہ ہو۔

دوسرا ورق

16 دسمبر 2014ء

قدم قدم دھند ہے، اندھیرا ہے، سورج روشنی کھو چکا ہے، ایک سکوت ہے...... گہرا سکوت ہے۔

آج دلوں کو دہلا دینے والا واقعہ پیش آیا ہے۔

کچھ دہشت گردوں نے سکول میں گھس کر معصوم بچوں کے سرتن سے جُدا کر دیے ہیں۔ آسمان لہولہو ہے...... ہوا میں بین ہیں...... ایک مجمع ہے...... ہجوم ہے...... افسردہ چہرے ہیں......خون ہے......اور کئی مائیں......کئی مائیں اپنے ڈوپٹوں کا، لباس کا ہوش کیے بغیر...... چلا رہی ہیں...... چنگاڑ رہی ہیں...... چیخ رہی ہیں...... بھوک کا احساس نہیں ہے...... پیاس کو بھول چکی ہیں......کیا کہہ رہی ہیں کوئی سمجھ نہیں پا رہا......

مذہبی جنونیت ایک مرتبہ پھر شعور کی دھجیاں اڑا گئی ہے......

مجھ پر ایک لرزا طاری ہے، میں اس منظر سے خوف زدہ ہوں...... میں یہ سوچ سوچ کر مرا جا رہا ہوں......کہ کیا......کیا اب میرے شہر میں اتنی زیادہ برہنہ عورتیں گھوما کریں گی......؟

شناختی کارڈ

کیفے ٹیریا کے ٹی وی پر بریکنگ نیوز چل رہی تھی......

دوپہر کے تین بج رہے تھے۔ایک ہلچل مچی ہوئی تھی، کہیں سے آواز آتی دو کوک، کوئی کہتا روٹی لانا بھئی، کہیں سے ویٹر کی آواز آتی جو تیزی سے گزرتے ہوئے ٹرین کے ڈبوں کی طرح ڈشوں کے نام بتا رہا ہوتا۔ جبکہ ایک جو بیس سالہ نوجوان ماحول سے بالکل بے خبر چائے کا کپ منہ کے قریب کیے، بہت غور سے، آنکھیں سُکیڑے، سامنے کچھ فاصلے پر دیوار میں نصب ٹی وی پر چلتی اس بریکنگ نیوز میں غرق تھا۔ایک بم دھماکے کے نتیجے میں ہونے والی ہلاکتوں کا ذکر ہو رہا تھا۔اس کا کلاس میٹ کیفے ٹیریا میں داخل ہوا، یہاں وہاں نظر دوڑانے کے بعد جب اسے کھانے کے لیے اپنا شکار نظر آ گیا تو اُس کے قریب آ کر کمر پر تھپکی دیتے ہوئے بولا'' کہاں چُھپا بیٹھا ہے؟''

وہ جیسے ٹی وی میں کھویا ہوا تھا ہڑ بڑا کر پیچھے دیکھا، چہرے سے حیرانی کے تاثرات کچھ کم ہوئے، ماتھے پر چڑھی بھوویں واپس اپنی جگہ پر آئیں''اوہ......آ فیصل......بیٹھ''

فیصل ساتھ ہی کرسی پر بیٹھ گیا'' کچھ کھایا پیا؟''

وہ چائے کا ایک سِپ لیتے ہوئے بولا'' ہاں کھا لیا کھانا، تُو نے کھانا ہے تو منگوا لیتے ہیں'' پھر نظر گھمائی اور ویٹر کو اشارے سے بلایا۔

فیصل نے کھانے کا آرڈر دیا۔'' کیا بات ہے بھئی، آج بڑا اداس بیٹھا ہے؟''فیصل نے مسکراتے ہوئے اُس کا کاندھا ہلکا سا ہلایا اور بولا۔

''ہوں......کچھ نہیں۔اداس تھا تو نہیں مگر ہو گیا۔''

''کیوں؟''

اس نے چائے کا کپ میز پر رکھ کر ٹی وی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا''ہاں یار۔ کیا ہے یہ؟''

''کیا ہے؟''،فیصل نے ٹی وی کی طرف گردن گھمائی کچھ دیر دیکھنے کے بعد مسکرایا''اوہ یار...... یہ تو روز کا کام ہے،اس کی اب کون ٹینشن لیتا ہے؟''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟''اُس کے چہرے سے پریشانی کے تاثرات غصّے میں بدل گئے۔

''مطلب عام سی بات ہے''

''عام سی بات ہے؟ اتنے انسانوں کی جان گئی اور تمہارے لیے عام سی بات ہے؟ کیسے سفاک انسان ہو تم۔افسوس ہوا سن کر''

''اچھا چل اب اتنا بھی سیریس لینے کی ضرورت نہیں ہے''

''ہاں تم جیسے یہی کہیں گے۔ یہ مذہبی استحصال، یہ قتال، انسانیت کی تذلیل اور بھوک جہالت ۔اُس پر پھر ان گندے اور اندھے سیاست دانوں اور ملاؤں کی خباثت......ہم لوگ کتنا کچھ سہتے ہیں اور پھر کہہ جاتے ہیں یہ تو روز کا معمول ہے۔ ہم کتنے بے حس ہوتے جا رہے ہیں......دیکھو......ان سب کو دیکھو، کسی کو پرواہ نہیں ،لگتا ہے کہ جیسے انسانوں کے مرنے کی خبر نہیں چل رہی بلکہ سٹاک ایکسچینج کے ریٹس کا بتایا جا رہا ہے جس سے عموماً کسی کا کچھ لینا دینا نہیں ہوتا۔ کتنے بے حس ہو گئے ہیں ہم......حیوان ہیں......حیوان......''وہ فیصل پر برس پڑا،فیصل اس کا چہرہ تک رہا تھا کہ اتنے میں ویٹر کھانا لے کر آیا اور میز پر رکھنے لگا۔

ویٹر کے جاتے ہی فیصل نوالہ توڑتے ہوئے بولا''بھئی اسلام کے خلاف سازش ہو رہی ہے، دیکھتے نہیں کیسے ہر اسلامی ملک میں تباہی ہے۔''

''بس کرو یار...... یہ سن سن کر کان پک گئے میرے......سازش......عجیب بات ہے۔''

اس کا رویہ اور زیادہ جارحانہ ہو گیا

''میں پوچھتا ہوں تمہاری قوم کے پاس ہے ہی کیا جو سازش ہو گی؟ نہ علم ہے نہ وہ ہنر کہ کفار تم سے جلیں، یار مذہب کو ایک تماشہ بنا لیا ہے، ہر گلی میں نعرے، ہر روز کوئی نیا مسلک کسی دوسرے پر چڑھائی کر رہا ہے، خدا کے نام پر وہ کچھ ہو رہا ہے کہ خدا خود اوپر بیٹھا پریشان ہو رہا

ہوگا۔شعیہ سُنّی کو مار رہا ہے،سنی شیعہ کو۔کیا ہے سب؟کسی کا نظریہ الگ ہے تو اس سے جینے کا حق چھین لیا جائے گا؟اسے چلتے پھرتے،کسی بازار میں،مسجد میں،گرجا گھر میں موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا؟اگر تمہارا نام کسی مسلک کو ظاہر کرتا ہے تو کسی بھی وقت مارے جا سکتے ہو۔سُنا تم نے؟صرف نام کی وجہ سے......مذہب کو ان لوگوں نے اپنی ملکیت سمجھ رکھا ہے۔دور کیوں جاتے ہو اپنی یونیورسٹی میں ہی دیکھ لو،کل کے لونڈے ابھی زمین سے پوری طرح اُگے نہیں کہ مذہب کا سٹیکر سینے پر لگا کر کھلی بدمعاشی کرتے پھرتے ہیں۔کون کس کے ساتھ بیٹھے،کون سی لڑکی کیا پہنے،کیا نہ پہنے سب وہی طے کرتے ہیں۔میں کہتا ہوں ایسے مذہبی غنڈوں کا یونیورسٹی میں کام ہی کیا ہے؟انھیں نکال کر باہر کیوں نہیں کیا جاتا؟وہ پڑھنے آتے ہیں کہ تحریکیں چلانے؟''

فیصل نے اپنے اردگرد نظر دوڑائی "اچھا چھوڑ۔کسی نے سن لیا تو پرابلم کریں گے۔اور تیری تو سمجھ ہی نہیں آئی آج تک۔کبھی کبھی تو لگتا ہے تُو مسلمان بھی نہیں ہے "فیصل نے بات پلٹانے کے لیے ہنستے ہوئے کہا۔

''ہاں ٹھیک کہہ رہا ہے تُو۔میں تو ٹھیک طرح سے مسلمان بھی نہیں ہوں۔اور مجھے ضرورت بھی کیا کہ ایسے مذہبی چکروں میں اپنا وقت برباد کروں۔ویسے بھی مذہب خدا اور انسان کے بیچ کا معاملہ ہے،اسے ان دونوں کے درمیان ہی رہنے دیا جائے تو بہتر ہے۔میرا خدا جانتا ہے کہ میں کسی مسلک میں پڑے بغیر اُس کو چاہتا ہوں اور اسے چاہنا ہی میرے نزدیک عبادت ہے۔اس کے لوگوں کو چاہنا عبادت ہے۔انسانیت اصل مذہب ہے،جس دن پوری دنیا اسی مذہب کی پیروکار ہوگئی،اس مذہب پر ایمان لے آئی تو دیکھنا یہ قتال ختم ہو جائے گا۔اور کچھ ہو نہ ہو فی الوقت یہ اجتماعی قتال،یہ گھناؤنا کھیل،بربریت،استحصال تو ختم ضرور ہو۔انسان کی نسل کشی تو ممکن ہی نہیں۔اور جس قوم نے بھی یہ کوشش کی خدا کی قسم سمجھو اس نے خودکشی کر لی......''

اُس کا لہجہ مدھم ہوا''جب ایسی خبر سنتا ہوں تو یقین کرو کسی فرقے سے کسی قسم کی ہمدردی نہ رکھنے کے باوجود اداس ہو جاتا ہوں۔میری اداسی کا سبب انسانی جانوں کا ضیاع ہے،چاہے وہ کوئی بھی ہو،کسی بھی فرقے کا ہو،کسی بھی مذہب کا ہو۔کوئی عیسائی مرتا ہے تو مجھے تکلیف ہوتی ہے،اتنی ہی تکلیف کسی سُنّی کے مرنے پر ہوتی ہے،اتنی ہی کسی شیعہ کے مرنے پر......کیوں کہ میں انسانوں کو ان کے رنگ نسل اور مذہب سے نہیں پہچانتا۔میری گنتی صرف اٹھتے جنازوں پر مرکوز

ہے، مجھے تکلیف ہوتی ہے جب کسی عورت کو بے سبب بیوہ کر دیا جاتا ہے، بچوں کو یتیم کر دیا جاتا ہے، کئی ماؤں سے ان کے لعل چھین لیے جاتے ہیں۔کبھی غور کیا تم نے؟ دھماکوں کے بعد سڑکوں پر خون سے لتھڑی ہوئی ننھی ننھی جوتیاں؟ چھوٹے چھوٹے بستے؟ کبھی غور نہیں کیا ہوگا۔تم بس گنتے ہو کتنے شعیہ مر گئے، کتنے سنی، کتنے عیسائی۔اور گنتی جاننے کے بعد گھسے پھٹے کچھ تبصرے کر کے چُپ ہو رہتے ہو...... بہت تکلیف ہوتی ہے...... بہت دم گھٹتا ہے یار اُس وقت ...... بہت دم گھٹتا ہے......''اس کے کان لال تھے،اور چہرے پر بے چارگی صاف نظر آ رہی تھی۔

فیصل چپ چاپ کھانا کھا رہا تھا،بس کچھ دیر بعد بوٹی توڑتے ہوئے''ہوں'' کر دیتا۔ زیادہ توجہ باتوں کی بجائے کھانے کی طرف ہی تھی۔فیصل نے پانی کا ایک گھونٹ بھر کر گلاس میز پر رکھا اور بولا''چھوڑ یہ باتیں۔یہ بتا کہ کب جانا ہے تُو نے اُس گوری کے گاؤں؟''ہلکی سی مسکراہٹ ہونٹوں پر آئی۔

فیصل کی بات سن کر پھیکی سی مسکراہٹ اُس کے چہرے پر بھی نمودار ہوئی''بس کل نکلوں گا۔اور کوئی گوری نہیں ہے تجھے دو چار خواب کیا سنا دیے تُو نے تو بات ہی پکڑ لی۔تُو جانتا ہے کہ میری تیری عمر کا نوجوان خداداد جذبات رکھتا ہے،اور وہ صرف محبت و رومانیت سے بھرے ہوتے ہیں۔ایک محبوبہ چاہتا ہے،اس کا دل کرتا ہے وہ کسی کو ٹوٹ کے چاہے،کوئی اسے ٹوٹ کر چاہے۔ سکون چاہتا ہے۔گانے سنتا ہے،دوستوں کے ساتھ ہنستا ہے،بے خوف قہقہے لگاتا ہے۔وہ زمانے سے بالکل غافل ہوتا ہے۔یہ عمر کمال کی ہوتی ہے۔مگر جس نوجوان میں یہ سب کچھ نہیں پایا جاتا تو سمجھ لو۔وہ ان خبیثوں کے بھینٹ چڑھ گیا۔کیوں کہ حیوانیت جب عقل پر پردہ ڈال دیتی ہے تو زندگی کا اصل رنگ نظر نہیں آتا۔''

یہ کہہ کر اس نے ایک لمبی سانس لی،مُسکراہٹ پھر چہرے سے جا چکی تھی۔

شعبہ نفسیات کا یہ سٹوڈنٹ زیادہ دوست نہیں رکھتا تھا،اور دشمنی کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔کوئی بھی بلاتا تو ہنس کر جواب دیتا۔خوش اخلاقی اس کا خاصہ تھا اور ہر وقت خوابوں میں رہنا اس کا بہترین مشغلہ۔اس کی تصوراتی دنیا بہت حسین اور افسانوی تھی۔وہ جانتا تھا کہ حقیقت کا اس سے دور دور تک کوئی تعلق نہیں ہے۔تخیلاتی دنیا تھی،جس میں اس کا گاؤں تھا۔جہاں کھیت لہلہا رہے ہوتے۔درخت ٹھنڈی چھاؤں بکھیر رہے ہوتے۔اور وہ پگڈنڈی......وہ پگڈنڈی جو کھیتوں

کے درمیان سے بل کھاتی گھروں کی جانب جارہی ہوتی...... پگڈنڈی کا خیال آتے ہی اسے اس پر ایک سُرمئی آنکھوں والی گوری چٹی اور سڈول بدن کی مٹیار چلتی ہوئی دکھائی دیتی، جو گاگر اُٹھائے مٹکتی چلی آ رہی ہے، اس مٹیار کا دمکتا روپ اُس کی دھڑکنوں کو تیز کر دیتا۔ وہ سوچتا اُن سرمئی آنکھوں میں ایک تلاش ہے، تلاش......اُس کی تلاش، مگر اُس نے تو گاؤں سے نکلتے ہوئے کسی سرمئی آنکھوں والی مٹیار سے لوٹنے کا وعدہ کیا ہی نہیں تھا۔

سبھی مناظر کی خوبصورتی وہ مٹیار اور اُسے اپنی گرفت میں لے لیتے اور وہ گھنٹوں انہی خیالوں میں کھویا رہتا۔

دراصل وہ اپنے اردگرد کے بھیانک ماحول سے فرار چاہتا تھا، اپنا گاؤں اسے واحد جگہ لگتی تھی جہاں سکون ہی سکون ہے...... وہ چاہتا تھا کہ انہی پگڈنڈیوں پر اُس سرمئی آنکھوں والی مٹیار کی بانہہ پکڑ کر بیٹھا لے اور اس کی آغوش میں سر رکھ کر آنچل کی چھاؤں تلے گھنٹوں سویا رہے۔

فیصل سے اچھی بات چیت تھی اور فیصل کو بھی کھانے کے پیسے دینے کے لیے اچھا انسان ملا ہوا تھا، گو کہ بھولا نہ تھا جو فیصل کو بھانپ نہ سکتا تھا، مگر پھر بھی فیصل اس کی باتیں سنتا اور وہ اس کے کھانے کے پیسے دے دیتا۔ یہ سودا مہنگا نہیں لگتا تھا کیوں کہ اُسے مزہ آتا جب فیصل اُسے کریدتا، مٹیار کے نام سے، کبھی گوری کے نام سے چھیڑتا۔ وہ گوری جو کہ حقیقت میں تھی ہی نہیں۔

یونیورسٹی کی کوئی خوبصورت لڑکی پاس سے گزرتی تو فیصل اسے اس طرف متوجہ کرتا وہ دیکھتا اور پھر کہہ دیتا "نہیں یار...... یہ لڑکیاں شرماتی نہیں ہیں۔ لجاتی نہیں ہیں۔ یہ مٹیریل میرے کام کا نہیں ہے۔" سمسٹر کا اختتام ہو چکا تھا، وہ بے چینی سے اپنی چھٹیوں کے انتظار میں تھا، اور جیسے ہی یونیورسٹی میں آخری امتحان ختم ہوا اس نے اپنے گاؤں کے لیے سامان باندھا اور نکل پڑا۔ گاڑی میں سوار ہوا، گاڑی ہچکولے کھاتی اُس کے گاؤں کی طرف رواں دواں تھی۔ اُس کے چہرے سے مُسکان ہٹتی ہی نہ تھی، وہ راستے میں کھڑکی سے سارے مناظر دیکھتا آ رہا تھا مگر سب بکواس لگ رہے تھے، اُس کے گاؤں کے کھلیانوں جیسے کہاں تھے۔ وہ پھر سو گیا اور پھر خواب آیا......

وہ اپنے گاؤں کی سرزمین پر تھا، اِس سے پہلے جب بھی اُس نے خواب دیکھا خود کو کہیں موجود نہ پایا تھا، مگر اس بار وہ وہیں تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں کو اپنے سینے پر پھیرا اور منہ آسمان کی طرف اُٹھا کر زوردار قہقہہ لگایا...... پھر پگڈنڈیوں کی طرف بھاگنے لگا، وہاں پہنچا تو اُسے

وہی سرمئی آنکھوں والی مٹیار گاگر اٹھائے آتی دِکھائی دی...... وہ ایک پل کے لیے رُکا اور پھر دوبارہ اُس کی طرف راستے کے نشیب وفراز کا خیال کیے بغیر بھاگنے لگا...... وہ بالکل پاس پہنچنے ہی والا تھا کہ اُس کا پاؤں مُڑا اور دھڑم سے زمین پر آ گرا......

گاڑی نے زوردار بریک لگائی، اُس کی آنکھ کھل گئی۔ دروازہ کھلتے ہی کچھ مسلح افراد بس میں داخل ہوئے، سب کو گاڑی سے نیچے اُتار دیا گیا، سب سے شناختی کارڈ طلب کر کے ان کے ناموں سے مذہب مسلک کا تعین کیا جانے لگا، اس کی باری بھی آئی؛

''کیا نام ہے؟''

''جی سرمد''

''پورا نام بول''

''جی سید سرمد حُسین شاہ''

چند گولیاں اُس کا سینہ چیرتے ہوئے نکل گئیں۔

اُس کا بے جان جسم اس جیسا نام رکھنے والوں کے ساتھ سڑک پر پڑا تھا۔ اُس کی پتھرائی ہوئی آنکھوں میں ایک سوال ابھرا ''کیوں...... کس لیے......؟'' اور یہ سوال وہیں اُس کے جسم کی طرح سرد ہو کر رہ گیا۔

کیفے ٹیریا کے ٹی وی پر بریکنگ نیوز چل رہی تھی......

بھتا وصولی

یُوں تو میں جنازوں میں شرکت نہیں کیا کرتا لیکن آج اکبر ولی کے جنازے میں محض اس لیے شریک ہوا کہ اسے دفن ہوتا اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ سکوں۔

اس نے کس قدر رعب سے بغیر کوئی لفظ کہے، بغیر کوئی کیس لڑے، لوگوں کی اس زمین پر اپنی جگہ گھیر لی ہے کہ وہ اس کا کرایہ دے گا نہ ٹیکس......اور صدیوں...... جب تک کہ اس کی قبر کا نشان مٹ نہیں جاتا......اس کی ملکیت اس دو گز کے ٹکڑے پر قائم رہے گی۔ نہ کوئی اس پر حق شفع کا مقدمہ کر پائے گا اور نا ہی اسے گریبان سے پکڑ کر یہ دھونس جمائے گا کہ؛

''تُو نے جو جگہ گھیری ہے......وہ میری ہے......''

میں اپنے اپارٹمنٹ کا تالا کھول رہا تھا کہ میری توجہ ایک عمر رسیدہ، اداس آنکھوں والے، ڈھلکے چہرے والے لاغر سے شخص کی جانب مبذول ہوئی۔ اس نے ہاتھ میں کارل مارکس کی تصویر والی ایک موٹی کتاب تھامی ہوئی تھی اور کھانستے ہوئے اپنے اپارٹمنٹ کا تالا بند کر رہا تھا۔

مجھے اس علاقہ میں کرائے پر گھر لیے چند ماہ ہوئے تھے لیکن میں نے اس کو نہیں دیکھا تھا، کچھ یہ بھی وجہ تھی کہ میں باہر صرف اسی وقت نکلتا ہوں کہ جب آفس جانا ہو، واپسی پر بازار سے اپنی ضروریات کی چیزیں بھی ساتھ لے آتا ہوں......اس مصروف زندگی میں کوئی دوست نہ کوئی رشتہ دار، سو میرے پاس جو چند گھنٹے بچ جاتے ہیں گھر میں پڑا کہانیاں لکھتا رہتا ہوں۔

شاید وہ اس دن میری دلچسپی کا سبب نہ بن پاتا اگر میں اس کے ہاتھ میں کتاب نہ دیکھتا، مجھے اندازہ ہوا کہ اس شخص کو ادب و فلسفہ سے ضرور لگاؤ ہے۔ میرے دل میں خواہش پیدا

ہوئی کہ کیوں نہ اس کے تجرباتِ زندگی اور علم میں سے کچھ نہ کچھ چُرا لیا جائے۔
میں نے اپنا دروازہ دوبارہ مقفل کیا اور اس کی جانب قدم بڑھائے؛
''ہیلو سر......''
اس نے اپنی اداس آنکھوں سے میری جانب کچھ دیر دیکھا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو؛
''ہیلو......آپ......''
''سر میرا نام قُربِ عباس ہے، آپ کے ساتھ والے اپارٹمنٹ میں رہتا ہوں۔''
''اچھا اچھا......خوشی ہوئی جان کر۔''
اس نے بااخلاق انداز میں جواب دیا اور پھر سیڑھیوں کی جانب چلنے لگا۔ میں بھی ساتھ ہولیا؛
''سر کارل مارکس کو پڑھ رہے ہیں؟''
وہ رُک گیا اور میری جانب دیکھتے ہوئے بولا؛
''جی پڑھ چکا ہوں...... یہ تو ایسے ہی بس واک کے بعد سوچا کچھ دیر بینچ پر بیٹھ کر مطالعہ ہو جائے۔'' وہ پھر مسکرایا۔
اس دن کے بعد میری اکبر ولی کے ساتھ آتے جاتے بات چیت ہونے لگی، نظریات کے معاملے میں بالکل شفاف انسان تھا اس لیے نشست بھی خوب رہتی۔ میں نے اپنے چند افسانے بھی پڑھنے کے لیے دیے جو اسے پسند آئے اور پھر سلسلہ چل نکلا۔
جب میں پہلی مرتبہ اس کے گھر گیا تو کمرے میں ڈھیروں کتابیں اور اخبار بکھرے پڑے تھے۔ ہر شے بے ترتیب تھی، کھانے کے برتن، چائے کا کپ نجانے کب سے میز پر رکھا ہوا تھا۔ اس کا کمرہ بھی اس کی زندگی ایسا تھا۔ بکھرا بکھرا......الجھا الجھا......خاموش......اور پرانا......
ایک دن اس نے سگریٹ سلگایا اور کہنے لگا؛
''قُربِ عبّاس...... ہم ایک ماچس کی ڈبیا بھی خریدتے ہیں تو اس پر بھی ٹیکس ادا کرتے ہیں......کس لیے......؟''
اس سوال کا جواب تو ہر شہری جانتا ہے، میں نے بھی اس سطحی سوال کا عام سا جواب

دے دیا؛

''سر کیوں کہ حکومت ہمیں سہولیات مہیا کر سکے......سب جانتے ہیں۔''

''ہاں......لیکن کون سی سہولیات؟ صحت......تعلیم......سڑکیں......تحفظ...... یہ ہے کہاں......میرا تو جب ایک ایک پیسہ حکومت کی طرف جاتا ہے تو یہ بھتا وصولی لگتی ہے......کہ جیسے کسی غنڈے کو جان بچانے کے لیے ادا کر رہے ہوں۔''

بات تو ٹھیک تھی، ہم سب جانتے بھی ہیں لیکن کیا کِیا جائے......سو میں نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔اس نے دوبارہ کہنا شروع کیا؛

''میں پہلے سگریٹ کا ایک پیکٹ پیا کرتا تھا۔اپنی پینشن ......''اتنا کہہ کر وہ رکا اور طنزیہ انداز میں ہنسا؛

''اپنی پینشن ......جو پینتس سال میں نے سرکاری نوکری کر کے اپنی ہڈیوں کے کھوکھلا ہونے تک محنت کے عوض حاصل کی ہے......جس رقم میں میری روٹی تک پوری نہیں ہو پاتی......''

وہ پھر دوبارہ اسی انداز میں ہنسا؛

''سگریٹ کا ایک پیکٹ لیتا تھا......پھر میں نے روز صبح کی واک کرتے ہوئے دیکھا کہ جوان عورت سڑکوں پر اخبار بیچ رہی ہے...... میں نے کافی عرصہ ہوا اخبار پڑھنا ترک کر دیا تھا......لیکن اس سے اخبار خریدنے لگا...... وجہ تم تو سمجھتے ہی ہو گے...... مجھے ان تھوڑے سے پیسوں کا اتنا ہی فرق پڑا تھا کہ بس روز کے پانچ سگریٹ کم کرنے پڑے......''

وہ کچھ دیر خاموش رہ کر کش لگا تا رہا اور پھر ایش ٹرے میں راکھ کو جھاڑتے ہوئے بولا؛

''پانچ سگریٹ اس دن کم کر دیے تھے......اور پانچ اس دن جب میں نے پھول بیچنے والے بچے سے ایک پھول خریدنا شروع کر دیا......اس ایک پھول سے بھی مجھے کوئی کام ہے نہ کوئی لگاؤ......بس خرید جو لیتا ہوں......قبرستان سے گزرتے ہوئے اپنے بیٹے اور بیوی کی قبروں کے درمیان وہ پھول رکھ کر کچھ دیر وہاں رکتا ہوں......اور گھر لوٹ آتا ہوں......''

میں نے کبھی اس کی ذاتی زندگی کے بارے میں نہیں پوچھا تھا، مجھے بالکل بھی اندازہ نہ تھا کہ وہ اپنی بیوی اور بیٹے کو کھو چکا ہے۔میرے اندر تجسس پیدا ہوا کہ میں ان کے بارے میں پوچھوں لیکن اس کا افسردہ چہرہ دیکھ کر خاموش رہا۔

''قُربِ عبّاس......میرے اردگرد بہت کچھ ایسا ہے کہ میں صرف چند سگریٹ گھٹا کر کچھ نہیں کر پاتا......ایک تو میں سگریٹ بہت سستے خریدتا ہوں دوسرا......دس سے کم تو پی بھی نہیں سکتا۔''اس کے چہرے پر بے کس و مجبور سی مسکان ابھری۔

میرے اور اس کے سگریٹ کے دھوئیں سے بھرے کمرے میں کچھ دیر خاموشی رہی اور پھر میں کہنے لگا؛

''آئی ایم سوری سر...... میں نہیں جانتا تھا کہ آپ کی وائف اور بیٹا نہیں رہے۔ اگر آپ اپنے ذاتی معاملات میں اس چھوٹی سی دخل اندازی کو برا نہ جانیں تو میں آپ کی فیملی کے بارے میں جاننا چاہوں گا۔''

اس نے ایش ٹرے پر جمی آنکھیں بہت آہستگی کے ساتھ اٹھا کر میری جانب دیکھا؛

''کیا جاننا چاہو گے دوست...... بتانے کو ہے بھی کیا میرے پاس......زندگی ہے اور بس گزار رہا ہوں......''

پھر میرے سگریٹ کے پیکٹ کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے اس نے مجھ سے پوچھا؛

''سگریٹ لے سکتا ہوں؟''

''جی جی سر......''میں نے ڈبیا اٹھا کر اس کے سامنے کر دی۔

''تھینکس ......میرے ختم ہو گئے۔''سگریٹ سلگایا اور پھر کرسی کے ساتھ اپنی کمر ٹکا لی؛

''میرا بیٹا......تمہاری عمر کا ہی تھا۔''

میں نے اپنی پوری عمر میں بس دو ہی کام کیے ہیں، پیسہ پیسہ جوڑ کر ایک یہ گھر بنایا...... دوسرا بیٹے کی تعلیم پر توجہ دی۔ وہ ہونہار تھا، میری محنت کو ضائع نہیں کیا اس نے بھی......لائق تھا...... تعلیم مکمل ہوئی تو اسے ایک پرائیویٹ فرم میں اچھی جاب مل گئی تھی۔ ہمارے دن سنور گئے تھے۔ میری ریٹائرمنٹ ہو گئی اور سکون سے اپنی بیوی اور بیٹے کے ساتھ رہ رہا تھا۔

اکثر سوچا کرتا تھا کہ اب جا کر سکون ملا ہے......ابھی ایک سال ہی گزرا تھا...... کہ وہ گھر لوٹ رہا تھا......شام کا وقت تھا...... بازار میں کچھ لوگوں کی آپس میں لڑائی ہو رہی تھی...... گولی چلی اور وہ اس کی زد میں آ گیا......"

اس نے سگریٹ کا ایک لمبا سا کش لگایا اور اسے ایش ٹرے میں دبا کر بجھا دیا؛

''میں تھانے میں رپورٹ درج کروانے کے لیے...... چکر کاٹنے لگا۔ کچھ عرصے کے بعد مجرم پکڑے بھی گئے...... میں نے کیس کو فالو کرنا شروع کیا...... پتہ چلا کہ وہ اسی علاقے کی مضبوط سیاسی پارٹی سے تعلق رکھتے ہیں...... مجھے دھمکیاں ملنے لگیں...... میں تو شاید نہ رکتا مگر میری بیوی بہت ڈر چکی تھی، اس کے اصرار پر میں خاموش ہو کر گھر بیٹھ گیا۔ ویسے بھی بیٹا تو جا چکا تھا...... اس عمر میں بیماری کی حالت میں مجھ سے یہ تھانے کچہریوں کے چکر کہاں کاٹے جاتے تھے۔

رہ گئے ہم دونوں بوڑھے میاں بیوی...... کرنے کو بات نہ کہنے کو کچھ...... خاموشی اور سکوت سا چھا گیا زندگیوں پر...... پینشن ہم دونوں کے لیے کم پڑ رہی تھی۔ سوچا جو تر کے کی زمین ہے...... اس کو بیچ کر فکس ڈپازٹ کروا دوں...... جو عمر رہ گئی ہے کم از کم روٹی تو سکھ سے کھا سکیں...... میرے حصے کی زمین کئی سال سے میرے بھائی کاشت کر رہے تھے...... انھیں جب یہ پتہ چلا کہ میں زمین بیچ رہا ہوں تو ان میں سے ایک نے کہا کہ وہ خریدنا چاہتا ہے...... میں نے اس سے بطور بیعانہ معمولی سی رقم لے کر زمین اس کے نام لکھوا دی...... بھائی تھا...... مجھے امید تھی کہ وہ اپنے وعدے پر مجھے پیسے ادا کر دے گا...... مگر ایسا ہوا نہیں...... بہت عرصہ مطالبہ کرنے کے بعد...... پنچایتیں بھگتنے کے بعد...... عدالت کا رخ کیا...... اور پھر پورا ایک سال...... ایک سال ذلالت سہتا رہا...... تھک ہار کر میں نے کیس ختم کر دیا...... اور رشتہ داری تو خیر پہلے سے ہی ختم ہو چکی تھی......''

وہ جو کچھ پل کی خاموشی تھی، ہماری سگریٹوں کا دھواں تھا...... مجھے حد سے زیادہ گھٹن کی شدت کا احساس دلانے لگے تھے۔ اکبر ولی کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا...... نہ کوئی کرب، نہ کوئی دکھ...... نہ حسرت...... نہ گلہ...... کچھ بھی تو نہ تھا اس کے چہرے پر...... وہ دوبارہ بولا؛

''بے چاری نے پوری عمر دکھ میں کاٹی تھی، اس کو تو میں شریکِ حیات نہیں...... شریکِ دکھ کہا کرتا تھا...... جگہ جگہ میرا حوصلہ بڑھاتی آئی تھی...... پر پھر وہ تھک گئی...... ہار گئی...... ٹوٹ گئی...... اور مٹی کو اوڑھ کر سکون سے بیٹے کے پہلو میں سو گئی۔''

اکبر ولی نے فلسفہ و ادب کی دنیا سے باہر نکل کر آج زندگی کی کس قدر تلخ حقیقت کا رُخ دکھایا تھا...... میں اسے جھوٹی تسلی و حوصلہ دینے سے بھی قاصر تھا۔

''قُربِ عبّاس...... ہم ٹیکس کیوں دیتے ہیں؟

ہمیں بدلے میں کیا چاہیے، کیا مل رہا ہے؟
زندگی ہر طرف پامال ہے......رسوا ہے......اتنی منتشر ہے کہ کیا کہوں......
تعلیم......
تحفظ......
انصاف......
صحت......
یہ...... یہ سب اتنی عمر کاٹ کر بھی میں نے کہیں نہیں دیکھے......''

جو سوال مجھے شروع میں معمولی سا لگا تھا...... میں نہیں جانتا تھا کہ وہ پھیل کر اتنا بڑا ہو جائے گا کہ مجھے کچھ کہنے کو ایک لفظ تک نہ ملے گا۔

کچھ ہی عرصہ گزرنے کے بعد اکبرولی کی حالت ایک رات اتنی بگڑ گئی کہ اسے میں سرکاری ہسپتال لے گیا...... وہاں کچھ روز گزار کر وہ شکستہ حال گھر واپس آیا، میں نے اس کو ایک کاندھے کا سہارا دیا ہوا تھا، ہم بہت آہستہ قدموں کے ساتھ چلتے ہوئے دروازے پر آ کر رکے...... جیب میں سے چابی نکال کر میں اُس کے اپارٹمنٹ کا تالا کھولنے لگا تو مجھے ساتھ کھڑے اکبرولی کا بیمار سا قہقہہ سُنائی دیا، پھر یہ الفاظ:

''ہونہہ......بھتا وصولی......ان کی ماں کی......''

میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو اس کی غصے سے بھری آنکھیں دروازے کے بائیں جانب چسپاں نوٹس پر جمی ہوئیں تھی...... جہاں لکھا ہوا تھا؛

نوٹس قبل از سیل پراپرٹی رتالا بندی

ہرگاہ بذریعہ نوٹس آپ کو مطلع کیا جاتا ہے کہ پراپرٹی مذکورہ بالا کے ذمہ مبلغ 15942 روپے پراپرٹی ٹیکس بقایاجات ہیں۔اس سلسلہ میں آپ کو تمام نوٹس ہائے دیے جا چکے ہیں اور اس سلسلہ میں متعلقہ انسپکٹر متعدد بار آپ سے مل چکے ہیں اور تمام نوٹس ہائے کی تعمیل کروا چکے ہیں لیکن تاحال وصول پراپرٹی ٹیکس نہ ہوئی ہے۔آپ پراپرٹی ٹیکس مذکورہ دیدہ دانستہ طور پر جمع کروانے سے گریزاں ہیں جو کہ خلاف قانون ہے۔

لہٰذا آپ کے مفاد میں ہے کہ آپ مورخہ 16 مارچ تک دفتر حاضر ہو کر زرمطالبہ

پراپرٹی ٹیکس مبلغ 15942 روپے داخل خزانہ سرکار کروائیں ورنہ پراپرٹی مذکورہ بالا سیل/قرق کر دی جائے گی............!!!!!

یُوں تو میں جنازوں میں شرکت نہیں کیا کرتا لیکن آج اکبر ولی کے جنازے میں محض اس لیے شریک ہوا کہ اسے دفن ہوتا اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ سکوں۔

اس نے......اس نے کس قدر رعب سے............

Mr. President

تیسری بار ٹیبل بیل بجائی گئی تو صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس ایک نوجوان تیزی کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ ٹیبل کے سامنے کھڑے ہو کر مودبانہ انداز میں ہاتھ باندھے:

"Yes Mr. President"

سامنے سیٹ پر بیٹھے پُروقار شخصیت کے مالک نے اپنی گہری آنکھوں سے کچھ دیر اس نوجوان کے جھکے ہوئے چہرے کی جانب دیکھا اور پھر کمرے میں اس کی کڑک دار آواز گونجی؛

"Where were you Saif? Dont you realize how I am stressed nowadays?"

"Sorry Mr. President, I was just"

نوجوان ابھی اتنا ہی بولا تھا کہ سامنے بیٹھا شخص اٹھ کھڑا ہوا، ٹیبل پر اپنی ہتھیلیاں جمانے کے بعد سامنے کی جانب جھکا اور دوبارہ اسی کڑک کو آواز میں لیے بولا؛

''دیکھو! میرے پاس، ہم سب کے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ فضول کاموں میں ضائع کیا جائے۔ ملک بہت زیادہ نازک صورتِ حال سے گزر رہا ہے اور ایسے حالات میں سے نکلنے کے لیے ہمیں رات دن ایک کرنا پڑے گا۔ بے پروائی بالکل بھی نہیں چلے گی۔''

"I understand Mr. President."

ٹیبل سے ہاتھ ہٹا کر وہ دوبارہ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ پیشانی کے بل ختم ہو گئے؛

''وائٹ ہاؤس سے ای میل کا کوئی جواب آیا؟''

''نہیں مسٹر پریزیڈنٹ ابھی تک کوئی جواب نہیں آیا۔''

نوجوان کی بات سُن کر اس نے بہت پُرفکر انداز میں کہا ''ہوں.....'' اور گہری سوچ میں پڑ گیا اس کے بعد کمرے میں اس کی اسی انداز میں آواز ابھری؛

''کوئی کسی کے لیے پریشان کیوں ہوگا؟ جو کرنا ہے ہمیں ہی کرنا ہے۔'' اور کمرے میں پھر خاموشی چھا گئی۔

"Well Let them go. We can sort it out."

نوجوان حسبِ معمول مودبانہ انداز میں بولا؛

"Yes Mr. President, we can."

نوجوان کی بات سُن کر اس نے اطمینان کے ساتھ سیٹ کی پشت سے اپنی کمر ٹکالی اور سامنے سے ایک پین اٹھا کر انگلیوں میں گھماتے ہوئے بولا؛

''ایسا کرو ایک ٹیم تیار کرو۔ ہمیں سب سے پہلے میڈیا پر نظر رکھنی ہوگی۔ خون خرابہ بالکل بھی نہیں دکھایا جائے گا۔ بلکہ نہ دکھانے سے بہتر ہے کہ اس کو جڑ سے ختم کیا جائے یہ لوگوں کی نفسیات پر بہت اثر انداز ہوتا ہے۔ ہمیں سب سے پہلے ایسے عناصر کا پتہ لگانا ہے جو اس قسم کا گھناؤنا کام کرتے ہیں۔ یہ کام ایجنسیوں کا ہے کہ وہ پتہ لگائیں۔'' اتنا کہنے کے بعد اپنے چہرے پر اکتاہٹ لیے بات کو آگے بڑھانے لگا؛

''ایک تو یہ ہماری ایجنسیاں..... کیا کام کر رہی ہیں؟ خیر.....ان کو ایک ایک پل کی رپورٹ کرنی پڑے گی۔ تمام دینی مدارس کو سرکاری سکولوں میں بدلا جائے..... وہاں پر گورنمنٹ ایک ہیڈ ماسٹر کو اپائنٹ کرے جو سارے معاملات پر نظر رکھے۔ ان مدرسوں کے بچے دینی تعلیم کے ساتھ باقی سبجیکٹ بھی پڑھیں گے۔ کیونکہ معاشرے کا بہتر انسان بننے کے لیے ان کی اشد ضرورت ہے۔''

اس نے کرسی گھمائی اور نوجوان کی طرف انگلی کا اشارہ کرتے ہوئے بولا؛

''اور ہاں.....سمر ویکیشن پر ٹیچر ٹریننگ کیمپ لگایا جائے۔ تین ماہ میں ان کو بچوں کی نفسیات، علم کو بچوں میں ٹرانسفر کرنے کے طریقے اور انگریزی پڑھائی جائے تاکہ وہ بچوں کو بہتر انداز میں پڑھا سکیں۔''

اتنا کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور کمرے میں ٹہلنے لگا؛

'' ٹیچر قوم کا معمار ہے......اس کا کام ہے کہ معاشرے کو مضبوط اور باشعور بنائے......
اور یہ اسی وقت ممکن ہے کہ جب وہ خود شعور رکھتا ہوگا۔ بچوں کو پڑھانے کے لیے ان کی نفسیات سے آ گاہی ضروری ہے۔ انگریزی کیونکہ پوری دنیا میں کمیونیکیشن کا میڈیم ہے سو اس لیے وہ بھی وقت کی ضرورت ہے۔''

وہ ٹہلتے ٹہلتے کبھی رک رہا تھا، کبھی دوبارہ چلنے لگتا تھا، اس کی ایک انگلی بار بار کمرے میں موجود نوجوان کی جانب اٹھتی۔ نوجوان سر جھکائے کھڑا 'یس مسٹر پریزیڈنٹ' کہتا جا رہا تھا۔

''دوسری بات......'' وہ حاکمانہ انداز میں بولا "ایجوکیشن میں صرف ایسے لوگ ہونے چاہییں جو نصاب میں تعصب سے پاک کنٹنٹ کو یقینی بنائیں۔ کتاب میں کسی ملک، مذہب، شخصیت یا فرقے کے نظریے کے بارے میں بتایا ضرور جا سکتا ہے لیکن اس کو جج کرنے کی اجازت بالکل بھی نہیں اور جو ایسا لکھ رہے ہیں......انہیں بین کر دیا جائے۔

تاریخ پڑھاتے ہوئے اس کو محدود مت کیا جائے اور جنگجو لوگوں کا ذکر محض تاریخ کے حوالوں کے ساتھ کیا جائے نہ کہ ان کی شخصیت کو ہیرو بنا کر پیش کیا جائے کہ ہمارے بچے بھی اس قسم کے مار ماری والے ہیرو بننے کی خواہش کریں۔

ہمیں عبدالسلام جیسے ہیرو چاہییں، ایدھی جیسے خدمت گزار مخلص لوگ......اور ملالہ جیسے ہونہار بچے۔

مار دھاڑ یا قتال......کسی بھی انسان کا کیا جائے، قابلِ فخر نہیں ہے کہ اس کے بارے میں قصیدے لکھے جائیں۔''

نوجوان نے اسی طرح ''یس مسٹر پریزیڈنٹ'' کہا اور ہاتھ باندھ کر کھڑا رہا۔

''اور سیف......ایک اور بات۔ پولیس...... یہ پولیس سارا دن کیا کرتی پھر رہی ہے؟ رشوت خوری......؟

ان کا کام ہے کہ مجرم کو فوری پکڑیں اور موقعہ واردات سے تفصیلات و ثبوت اکٹھے کر کے عدالتوں کے سامنے رکھیں......''

عدالت کا لفظ اس نے مسکراتے ہوئے دھرایا؛

''ان سب کو بعد میں دیکھتے ہیں، فی الحال پولیس کے ذمے ایک کام لگاؤ۔ چائلڈ

لیبر...... چائلڈ لیبر نہیں نظر آنی چاہیے۔ جو بچے ہوٹلوں پر، دوکانوں پر، آٹو ورکشاپ پر کام کرتے دکھائی دیتے ہیں ان کو فوراً سکول بھیجنے کا انتظام کیا جائے۔ باپ کا کام ہے کہ وہ اگر پیدا کر رہا ہے تو کما کر کھلائے بھی۔ کچھ اس کو الاؤنس بھی دیا جائے گا اور پھر اس کی مزدوری کی اتنی اجرت جس میں وہ اپنے بچوں کا پیٹ پال سکے...... تاکہ بچے کے کام چھوڑنے پر جو گیپ آیا ہے اس کو پُر کیا جا سکے۔''

وہ چلتے چلتے رک گیا۔ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالتے ہوئے گہری سوچ چہرے پر دکھائی دینے لگی۔

''دہشت گردی......اس کا کیا کیا جا سکتا ہے۔''

نوجوان مدھم سی آواز میں بولا؛

''مسٹر پریزیڈنٹ......آرمی اس کے لیے کام کر رہی ہے، آپریشن ابھی تک جاری ہے۔''

اس نے سر اٹھا کر نوجوان کی جانب دیکھا؛

''اب تک جاری ہے؟ لیکن کہاں ہو رہا ہے یہ آپریشن؟ دھماکے تو اسی طرح ہو رہے ہیں۔اور پھر......اور پھر یہ کیا کہ اتنے عرصے میں ابھی تک حالات بھی وہیں کے وہیں ہیں۔

تم ایسا کرو میری چیف آف آرمی سٹاف سے ایک میٹنگ فِکس کرو، اس بات پر زور دینے کی ضرورت ہے کہ فوراً کوئی حل نکالا جائے۔

حالات دن بہ دن بگڑتے جا رہے ہیں۔''

وہ کچھ دیر خاموشی سے ٹہلتا رہا، قدم کسی فوجی افسر کی طرح دبا دبا کر رکھ رہا تھا۔ چہرے پر فکر اور رعب کے ملے جلے تاثرات نمایاں تھے۔ پھر اس نے اپنے نچلے ہونٹ پر شہادت کی انگلی رکھتے ہوئے کہا؛

''میں کچھ بھول رہا ہوں......شاید کچھ بھول رہا ہوں۔

ہاں! یاد آیا...... مجھے قوانین میں ترمیم کرنے پر بھی عوام کو اعتماد میں لینا ہے۔ مجھے یہ بتانا ہے کہ کانسٹی ٹیوشن کا مذہب کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ کئی ایسے قوانین ہیں کہ جن کا غلط استعمال کیا جا رہا ہے۔ اسی لیے ہمارے ہاں اقلیتیں پس رہی ہیں۔''

نوجوان نے سر اٹھایا اور بولا؛

''لیکن مسٹر پریزیڈنٹ''

اس نے نوجوان کی بات کاٹی؛

''بس......اس معاملے میں کسی کی بات نہیں سننا چاہتا......''اس کا رویہ کچھ جارحانہ ہوا

''اس ملک میں بسنے والا ہر انسان برابر کا حق رکھتا ہے۔اگر اس کے فرائض بھی برابر ہیں......

اقلیتیں یہاں محفوظ نہیں ہیں۔ان کو تحفظ دینا ہوگا اور ہر طرح سے برابر حق بھی۔

کیونکہ میں کہہ چکا ہوں کہ کسی کا کوئی بھی مذہب ہو یہ حکومت کا معاملہ نہیں ہے۔

حکومت کی نظر میں انسان صرف انسان ہے اور میرے ملک کے ہر شہری کا دفاع اور فلاح ہی حکومت کا مقصد ہے۔دیٹس اِٹ۔''

وہ کڑے لہجے میں نوجوان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ،ٹیبل کے پاس آ کر ایک سگریٹ اٹھا کر سُلگایا اور سیٹ پر بیٹھ گیا؛

''یہ ساری ہوا جاہل قسم کے مذہبی رہنماؤں کی پھیلائی ہوئی ہے۔ان پر بھی کڑی نظر رکھنا ہوگی۔

بلکہ ایک کام کرو تم...... دو چار روز میں ایک ایسی میٹنگ کا انتظام کرو جس میں تمام مذہبی رہنما ہوں۔ان سے بات چیت کر دیکھتے ہیں۔مکمل طور پر ہر مذہبی جماعت پر پابندی ہوگی۔کوئی مسجد لاؤڈ سپیکر کا استعمال نہیں کر سکتی۔مساجد کو گورنمنٹ اپنی تحویل میں لے......مساجد کو مسلک کے ساتھ نہیں جوڑا جائے گا اور ہر مسجد کا پیش امام حکومت کی جانب سے اپائنٹ کیا جائے گا۔اس کے علاوہ کوئی بھی منبر پر آ کر بات نہیں کر سکتا۔

سکیورٹی ان باتوں پر سختی سے عمل درآمد کرے۔''

سگریٹ کا گہرا کش لگا کر وہ نوجوان کی طرف دیکھنے لگا۔پھر ایک اور کش لگایا اور بولا؛

''حالات بہت خراب ہیں......بہت زیادہ......جلد از جلد تمام انتظامات ہو جانے چاہیے۔

اور یہ کرپٹ سیاست دان...... پارلیمنٹ سے اٹھا کر باہر کرو۔ٹیکس کی جانچ پڑتال کرو......نادھندگان کے خلاف فوری کارروائی......فالتو اثاثے فوری طور پر ضبط کر کے ڈویلپمنٹ پروگرام میں لگاؤ۔پارلیمنٹ میں بیٹھنے کے لیے تعلیمی قابلیت پہلی شرط ہونی چاہیے۔ماسٹر سے کم

کوئی بھی ایسا شخص وہاں نظر نہ آئے......

"Understood?"

فیکٹری یا کسی بھی بڑی جائیداد کا مالک پارلیمنٹ میں نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ سرمایہ دار یا جاگیردار آج تک ایک عام انسان کے لیے بھلا کر سکے ہیں نہ کریں گے۔ پارلیمنٹ میں صرف اور صرف پڑھا لکھا، صاحبِ بصارت اور باشعور انسان ہونا ضروری ہے اور ہو بھی متوسط طبقے سے......''

پھر کچھ توقف کے بعد وہ دوبارہ اپنی بارعب آواز میں بولا؛

''اور فریڈم آف ایکسپریشن...... یہ بھی بہت ضروری ہے۔ کنٹنٹ پر غور کرو......ہمیں چیختے چنگاڑے ہوتے خطیبوں سے زیادہ مہذب مفکروں کی ضرورت ہے۔

آج میں خاموشی کے ساتھ باہر کی سڑکوں پر گھومنا چاہتا ہوں ڈرائیور سے کہو کہ گاڑی نکالے۔''

نوجوان گھبرا کر ہکلاتے ہوئے بولا؛

''آ......مسٹر پریزیڈنٹ......وہ......ب باہر......نہیں جا سکتے آپ اس وقت۔''

اس نے قدرے کرخت لہجے میں پوچھا؛

''کیوں......کیوں نہیں جا سکتا؟''

''مسٹر پریزیڈنٹ......باہر بہت زیادہ دھند ہے......کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا۔''

''دھند......اس بلڈی دھند کو ابھی اس وقت ہونا تھا؟''

ڈور بیل بجنے کی آواز آتے ہی دونوں نے کمرے کے دروازے کی جانب دیکھا۔ کچھ ہی دیر کے بعد سوٹ میں ایک شخص کمرے کے اندر داخل ہوا۔ نوجوان نے اسے دیکھتے ہی کہا؛

''آیئے ڈاکٹر''

ڈاکٹر نے اپنا باکس ایک طرف رکھ کر دونوں سے ہاتھ ملایا۔ وہ شخص ڈاکٹر سے مخاطب ہوا؛

''کیوں ڈاکٹر......خیریت ہے؟''

ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا؛

''جی مسٹر پریزیڈنٹ، آپ کا روٹین چیک اپ کرنا تھا۔ آپ یہاں بیڈ پر آ جایئے''

''اوہ اچھا......آیئے۔''

وہ دیوار کے قریب پڑے بستر پر جا کر بیٹھ گیا؛

''ڈاکٹر......آپ ابھی باہر سے آئے ہیں، کیا دھند میں آپ کو کوئی مشکل پیش نہیں آئی؟''

''ام......نہیں مسٹر پریزیڈنٹ۔ "ڈاکٹر نے کچھ رک رک کر جواب دیا اور نوجوان کی جانب دیکھا۔

''نہیں......؟''اس شخص نے حیرت سے بھری نظر ڈاکٹر کے چہرے پر ڈالی۔

''نہیں میرا مطلب تھا کہ دھند کی وجہ سے بہت مشکل ہوئی یہاں تک پہنچنے میں۔لیکن جب آپ''

اس نے فوراً ڈاکٹر کی بات کاٹی؛

''ڈاکٹر......کیا باہر اس وقت......اس سردی میں......اس دھند میں......کوئی بچہ سردی سے ٹھٹھر تو نہیں رہا تھا......؟''

ڈاکٹر کچھ دیر تو خاموش رہا پھر مدھم سی آواز میں بولا؛

''نہیں مسٹر پریزیڈنٹ......نہیں......کوئی نہیں۔''

اس نے سکون کی سانس لی؛

''شکر ہے۔ میں تب سے پریشان ہو رہا تھا۔ آپ جانتے ہیں ڈاکٹر میں یہ سب نہیں دیکھ سکتا۔کم از کم اپنے ملک میں تو بالکل بھی نہیں۔

سیف......سیف......''

لڑکے نے ایک قدم آگے بڑھایا؛

"Yes Mr. President"

''سیف......میری میڈیا کے ساتھ ایک پریس کانفرنس رکھواور اس میں......'' اتنا کہہ کر وہ رک گیا اور چہرے کے تاثرات بدلنے لگے......''پریس کانفرنس...... پریس کانفرنس......'' بڑی اور گہری آنکھیں پھیلنے لگیں۔''پریس کانفرنس......نہیں......نہیں......ڈاکٹر یہ شور نہیں......

سیف...... مجھے جیل نہیں جانا ہے۔نہیں جانا ہے جیل مجھے......'' وہ ڈرنے لگا۔

اس کی آنکھوں کے سامنے وہی منظر دوبارہ ابھر کر آ گیا...... کمرہ اسے بڑا ہال معلوم ہونے لگا، جو لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا ہے۔اور وہاں صدر اپنے کارناموں کو بڑھا بڑھا کر سنا رہا ہے۔اور وہ صحافیوں کے دستے میں بیٹھا لکھے جا رہا ہے...... یہ جھوٹ اس سے لکھا نہیں جا رہا...... اس کا قلم کانپ رہا ہے......اس کے ماتھے پر سے پسینہ بہہ رہا ہے...... جذبات میں شدت آ رہی ہے...... پھر وہ اٹھتا ہے اور جوتا اتار کر صدر کی جانب اچھال دیتا ہے...... ہال میں شور برپا ہوتا ہے......سکیورٹی اسے گھسیٹتے ہوئے لے جاتی ہے......

یہ سب مناظر اس کے ذہن نے دوہرائے تو وہ لرزنے لگا۔

ڈاکٹر نے ایک ہاتھ اس کی کمر اور دوسرا سینے پر رکھ کر بیڈ پر لٹایا تو اس کے مزاج میں کچھ تحمل پیدا ہوا۔ڈاکٹر نے اس کی آنکھوں کا باغور معائنہ کیا اور پھر اپنے باکس میں سے انجیکشن نکال کر بھرنے کے بعد ایک ہاتھ سے اس کی آستین کو اوپر کیا؛

''ڈاکٹر مجھے ابھی بہت کام کرنے ہیں۔ بہت کچھ باقی ہے......سوچ میرا پیچھا نہیں چھوڑتی، میرے ذہن میں ہر وقت روتی ہوئی عورتوں کا شور گونجتا رہتا ہے......میری آنکھوں کے سامنے ہوٹل پر کام کرتے بچے ہاتھ میں خالی پلیٹ تھامے بھوک سے بجھے ہوئے چہرے لیے نیند سے جھولتے رہتے ہیں...... گندے گریس سے میلے کچیلے کپڑوں والے بچوں کو میں اور نہیں دیکھ سکتا...... میں...... میں اب ان ماؤں کے رونے کی آوازیں مزید نہیں سن سکتا...... میں بلکتے سسکتے چہروں کو اور نہیں دیکھ سکتا...... میں یہ سب اپنے ملک میں نہیں دیکھ سکتا......''

ڈاکٹر نیند کا انجیکشن لگا چکا تھا۔اس شخص کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ بڑبڑاتے ہونٹوں سے مدھم مدھم آواز نکل رہی تھی۔

ڈاکٹر اٹھ کر نوجوان سے مخاطب ہوا؛

''دن بدن ان کی حالت بگڑتی جا رہی ہے۔''

نوجوان چہرے پر افسردگی لیے کہنے لگا؛

''ڈاکٹر......کیا ایک صدر کی ہتک کرنے پر تین سال جیل میں بند کیا جا سکتا ہے؟ کیا......فٹ پاتھ پر پامال ہوتی زندگی کی کوئی عزت نہیں ہے......؟

سڑکوں پر بلدیہ کی گاڑیاں جب پانی کی موٹی دھاروں سے خون دھوتی ہیں......تو اس خون کا حساب کسی سے کیوں نہیں لیا جاتا......؟

ان زندگیوں کو پامال کرنے پر کسی کو سزا کیوں نہیں سنائی جاتی ؟''

ڈاکٹر خاموش رہا تو نوجوان روہانسی آواز میں بولا ؛

''بھائی جان اب تو سارا سارا دن چلاتے ہیں......اور نجانے کیا کیا کچھ کہتے رہتے ہیں ۔ دو دن سے سو نہیں سکے ۔کل بھی چیخنے لگے تھے...... باہر نکلنے کی کوشش کر رہے تھے مجبوراً باندھنا پڑا۔آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں......حالت بگڑتی جارہی ہے ۔''

کمرے میں ایک مرتبہ پھر خمار سے بھری آواز کسی شعلے کی طرح ابھری ؛

''میرا پین......میرا پین......خالی ہے......کچھ روشنائی......''

رابو کی ڈائری

شادی کے ایک مہینہ بعد ہی ارشد دوبئ چلا گیا۔اس کے چلے جانے کے بعد سیما کو تھک کر سونا ہی بھلا لگتا تھا، ویسے نیند کہاں آتی تھی۔ وہ سارا دن خود کو گھر کے کاموں میں الجھائے رکھتی، کھانا پکانا، صفائی ستھرائی، اور دوسرے چھوٹے موٹے کاموں میں دن کہاں گیا پتہ ہی نہ چلتا۔گرمیاں گزر رہیں تھیں،سردیوں کی آمد آمد تھی جس کی وجہ سے اس بار کچھ زیادہ ہی کام چھیڑ بیٹھی......سارا سامان کمروں سے باہر نکالا، جالے جھاڑے، دروازے دھوئے، کھڑکیوں پر گیلا کپڑا پھیرا......گرمیوں کے بستر اندر رکھے،سردیوں کے باہر نکالے۔اس کے بعد بہت سارے پھٹے پرانے کپڑے شمو کے حوالے کیے...... پرانے برتن، کاغذ، رسالے،میگزین،نجانے گھر کے کس کس کونے کھدرے سے نکال کر شمّو کے ہاتھ کباڑیے کے ہاں بھیج دیے۔سامان باہر نکالتے ہوئے جب چھ فٹ کی بڑی لوہے کی پیٹی سٹور میں سے ایک طرف ہٹائی تو اس کے پیچھے سے ڈائری ملی جو اس نے اپنے پاس ہی رکھ لی۔

سیما کا ساتھ شمو کام والی کے علاوہ دیتا بھی کون ،مردان کاموں میں پڑتے نہیں۔ ویسے بھی اس گھر میں ایک دیور ہی تھا، جو صبح دکان پر جاتا اور رات کو لوٹ کر آتا،ارشد اور بڑے بھائی دوبئ ہوتے تھے۔بڑے بھائی کے تین بچے جو سکول چلے جاتے۔اور رہی بڑی بھابھی...... وہ تو ہر وقت بیماری کا بہانہ کر کے کمرے میں پڑی رہتی۔

سارے گھر کی صفائی مکمل کر کے سیما نہائی اور کمرے میں آ کر خود کو بستر پر گرا دیا، کمر درد سے ٹوٹ رہی تھی۔ٹانگوں میں کھلیاں پڑ رہی تھیں۔یوں چُو رہو کر لیٹتے ہی اسے پہلے سے زیادہ راحت محسوس ہوئی۔ابھی لیٹے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ ایک جھٹکے سے اٹھی اور دروازے کی بائیں

جانب رکھی کپڑوں کی الماری کھول کر اس میں سے وہی بوسیدہ ڈائری نکالی جو اسے کام کے دوران سٹور میں سے ملی تھی۔ ڈوپٹے سے اس پر جمی گرد کو جھاڑا اور ورق گردانی کرتے ہوئے دوبارہ بستر پر دراز ہوگئی۔

ڈائری کے سارے اوراق پیلے ہو رہے تھے۔ کچھ نظمیں تھیں۔ کچھ غزلیں۔ اور کہیں کہیں کچھ تحریریں۔ یہ ڈائری سیما کی نند رابعہ کی تھی جسے رابو کہہ کر بلایا کرتے تھے۔ سیما کی شادی کو چھ ماہ ہوئے تھے اور رابو اس سے بھی کچھ مہینے پہلے اپنے گھر کی ہو چکی تھی۔

ورق گردانی کے دوران سیما نے دو نظمیں پڑھیں اور پھر ایک تحریر پر آ کر رک گئی۔ یہ وہ تحریر تھی جو رابو نے اپنی شادی کے تین دن پہلے لکھی تھی۔

''بہت شور مچا ہوا تھا، آخر آ ہی گئی وہ گھڑی۔ تین دن بعد بارات آئے گی، اور میں اپنے گھر چلی جاؤں گی۔'' سیما کے چہرے پر پہلا جملہ پڑھتے ہی مسکراہٹ نمودار ہوئی، اس نے پڑھنا جاری رکھا۔

''حیرانی ہے، سبھی کہتے ہیں اپنے گھر جا رہی ہوں، مگر گھر والوں کے مزاج سے ان کے طور طریقوں سے بالکل بھی واقف نہیں۔ مجھے تو یہ بھی نہیں پتہ کہ گھر کیسا ہے...... گھر کیسا ہے یہ تو نہیں جانتی مگر وہاں جا کر کیا ہوگا یہ ضرور جانتی ہوں۔ دو دن یہی ڈھول ڈھمکا، ناچ گانا چلے گا، اس کے بعد بارات آئے گی سبھی رو دھو کر مجھے اس گھر سے نکال دیں گے۔ باراتیے مجھے لیجا کر سامنے بٹھا لیں گے اور ایسے خوشیاں منائیں گے جیسے کوئی لاٹری نکل آئی ہے، لاٹری تو ہے ہی۔ ایک عدد انسان کے ساتھ پورے گھر کا سامان مفت......'' سیما کی معمولی سی ہنسی ناک کے نتھنوں سے نکلی، مسکراہٹ چہرے پر ابھی تک قائم تھی۔

''انھیں ناچتے ناچتے رات ہو جائے گی، پھر مجھے بستر تک چھوڑ جائیں گے۔ وہ آئے گا چند باتیں کرے گا اور بتی بجھا کر جو جی میں آئے کرے گا۔ کچھ مہینے اس کی بھی خوب عیاشی رہے گی، پھر واپس سعودیہ لوٹ جائے گا اور میں اپنے پیٹ میں اس کا تخم سمو کر نو مہینے انتظار کروں گی......''
یہاں آ کر سیما کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہوگئی۔ اس نے باہر کے دروازے کی جانب دیکھا، ذرا اٹھ کر بیڈ کے ساتھ ٹیک لگائی اور ٹانگیں سمیٹ کر ڈائری کو گود میں رکھ لیا۔

''اسے اس بات کے بارے میں بھی کچھ عرصے بعد بتایا جائے گا، وہ سب سے

مبارکیں بٹورے گا اور پھر مجھے بھی فون پر کہے گا 'ہاں......کیسی ہو؟ اچھا...... اپنا بہت خیال رکھنا......'اور میں بس 'جی' کہوں گی......کچھ کہنا بھی چاہوں گی تو اپنے اردگرد بھیڑ دیکھ کر خاموش رہ جاؤں گی......پھر وہ ایک سال بعد آ کر اپنے دو مہینے کے بچے کے ساتھ خوب کھیلے گا اور جاتے جاتے اگلے کا بیج بھی بو جائے گا۔ میں پھر وہ تخم بھی نو مہینے اپنے شکم میں رکھوں گی...... یہ سلسلہ چلتا رہے گا، جب تک وہ چاہے گا۔'' سیما کی پیشانی پر سلوٹیں آ چکی تھیں۔

''بڑی بھابھی کی جیسی زندگی ہوگی میری بھی۔ مگر کیا کروں۔ یہاں رہنا بھی تو دشوار ہو گیا اب۔ بڑی بھابھی کے طعنے کون سنتا رہے۔ میں تو ٹوٹ کر بکھر جاتی ہوں، روز ہی۔ ایک شیشے کی طرح......اور میری کرچیاں کہاں کہاں جاتی ہیں میں خود نہیں جانتی۔ ہواؤں کے پیچھے بھاگتی ہوں، خیالوں کے بہت سارے تانے بانے بُنتی ہوں۔ رات رات بھر جاگتی ہوں، تنہا ہی گھنٹوں صحن میں ٹہلتی رہتی ہوں، کبھی چھت پر......کوئی کیا جانے کہ مجھے اس گھر سے کوئی لگاؤ نہیں۔ بچپن سے ہی بتایا گیا ہے کہ یہ گھر میرا نہیں اور جہاں جاؤں گی وہ گھر بھی میرا کہاں ہوگا؟ ایسے بہت سارے سوال دماغ میں گردش کرتے رہتے ہیں۔ میں کیسی ذات رکھتی ہوں؟ میں انسانوں کی کون سی صف میں کھڑی ہوں؟ یہ لوگ...... یہ لوگ جو مجھے کہتے ہیں کہ میرا مستقبل اچھا ہوگا، میرے حال تک سے تو واقف نہیں۔ کیسے مان جاؤں کہ ان کی باتوں میں صداقت ہے؟'' سیما نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور آنکھیں ڈائری سے ہٹا کر کچھ پل چھت کے ایک کونے میں دیکھتے، نچلے ہونٹ کو دانتوں میں لیے کچھ سوچا اور پھر سے پڑھنا شروع کیا۔

''بھیّا سے ملنے پر سب کو اعتراض ہے۔ کیوں نہ ملوں؟ میری بات سنتے ہیں۔ میری بات مانتے ہیں، مجھے اپنا کہتے ہیں۔ نجانے سب کو کیا تکلیف ہوتی ہے جب میں بھیا سے ملنے جاتی ہوں۔ مجھے کہا جاتا ہے تمہارے اپنے بھائی بھی ہیں ان سے پیار کروں، میرے اپنے بھائیوں اور بھیا میں بہت فرق ہے۔ ابھی پچھلی عید کی ہی تو بات ہے، بڑی بوا یہیں تھی ان کے سامنے کیا تماشہ لگا......وہ تھیں تو جان بچ گئی ورنہ لپکے تھے مارنے کو...... پتہ چلا کہ بھیا نے میرے لیے سوٹ خریدا ہے اور گل بانو کو پیسے دیے کہ دونوں بہنیں جا کر بازار سے جو لینا ہے لے لو۔ میں نے اپنے جمع کیے ہوئے پیسوں سے بھیا کے لیے ایک پرفیوم لے لیا سبھی کے سینوں پر سانپ لوٹنے لگے۔ کہتے تھے سوٹ واپس کر دوں، وہ تو بوا جی بولیں کہ کیوں واپس کر دے سوٹ؟ کیا برا

کیا؟ وہ بھائی کہتی ہے اُسے، اُس نے سوٹ لے دیا تو اِس نے بھی پرفیوم دے دیا۔ اب ایسے پیچھے پڑنے کا کیا مطلب ہوا؟ بھابھی نے کیا کیا طعنے نہ دیے، سگے بھائیوں نے کیا کیا نہیں کہا......بس ہاتھ اٹھنا باقی رہ گیا تھا، بوا نہ ہوتیں تو وہ بھی ہو جاتا۔

اب خوش ہوں لیں، جا رہی ہوں۔ سالوں بعد لوٹ کر آیا کروں گی۔ سچ کہوں تو مجھے یہاں سے جا کر کسی کی یاد نہیں آئے گی۔ ہاں مگر جب جب کوئی میری بات سننے والا نہ ملے گا تو بھیا کی یاد آئے گی، جب جب میرا دل کرے گا کہ کوئی مجھے پیار کے میٹھے بول کہے تو بھیا کی یاد آئے گی۔ جب جب میرا جی دنیا سے اٹھ جایا کرے گا تو کوئی حوصلہ دینے والا بھیا جیسا چاہیے ہوگا۔ مگر کیسے آؤں گی بھیا کے پاس؟ میرے اپنے تو برداشت نہیں کرتے، میرا سسرال کیسے برداشت کرے گا۔ میاں تو طلاق کی دھمکی طمانچے کی طرح منہ پہ مار کر چپ کرا دیں گے......''

دروازہ کھلا تو سیما نے ڈائری فوراً بند کر دی۔ بڑی بھابھی سر پر پٹی باندھے سامنے کھڑی تھی۔ "اے سیما میری بہن......دو روٹیاں پکا لے......میرا سر تو آج میری جان لے کر رہے گا...... "یہ کہہ کر بڑی بھابھی سیما کا جواب سنے بغیر کمرے میں سے کھسک گئی اور سیما ڈائری الماری میں رکھ کر کچن کی طرف چل پڑی۔

کچھ دن بعد رابو اپنا نومولود بچہ گود میں لیے میکے آ گئی۔ آنکھوں کے گرد حلقے تھے، گالوں پر چھائیاں......اُداس سا چہرہ......کوئی بات کرتا تو جواب دیتی، کوئی ہنستا تو پھیکی سی ہنسی وہ بھی ہنس دیتی......اسی دوران ایک دن سیما نے دیکھا کہ رابو سٹور میں کچھ ڈھونڈ رہی ہے۔ سیما سمجھ گئی۔ رابو اپنی ڈائری تلاش کر رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ رابو کو ڈائری دے دے، مگر پھر خیال آیا کہ وہ کیا سوچے گی، کہ میں نے اس کی ڈائری اپنے پاس رکھی، پڑھی بھی ہوگی۔ کسی کی ڈائری ایسے پڑھنا اچھا نہیں۔ وہ نجانے کیا کیا کہہ دے۔

رابو ڈائری کے لیے بے چین تھی۔ وہ سٹور میں کئی چکر لگا چکی تھی۔ جب سیما نے اس کی بے چینی دیکھی تو اس سے بات کی۔

''رابو......تم کچھ سٹور میں ڈھونڈ رہی تھیں؟''

''نہیں...... میں تو ایسے ہی......تم لوگوں نے ساری سیٹنگ بدل دی۔ پیٹی کو سامنے والی دیوار سے ہٹا کر شلف والی دیوار کے آگے رکھ دیا۔ شیلف پر برتن رکھے ہوتے تھے۔''

''ہاں...... برتن وہاں سے اٹھا لیے تھے۔ چھوٹے صحن کا دروازہ پیٹی کی وجہ سے بند رہتا تھا، سوچا ایسے وہ بھی کھل جایا کرے گا۔'' سیما نے رابو کے بچے کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا

''سیما وہ......'' رابو یہ کہہ کر کچھ دیر رکی، سیما اس کی طرف متوجہ ہوئی......''سیما میری کچھ چیزیں تھیں۔ میرا مطلب ایک ڈائری تھی کچھ شعر لکھے ہوئے تھے اس پر......کل میں دیکھتی رہی، کہیں نہیں ملی...... پھینک دی کیا؟'' رابو نے رک رک کر سوال کیا۔

سیما نے کچھ پل اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور مسکرائی ''نہیں...... کیسے پھینک سکتی تھی۔ میرے پاس ہے، الماری میں رکھ لی تھی، سوچا تم آ جاؤ تو دے دوں گی۔''

رابو نے سیما کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا ''وہ......اچھا کیا رکھ لی...... ایسے ہی بس......لکھا تھا اس میں۔ تمہیں تو پتہ ہی ہوگا، شادی سے پہلے سبھی کو شوق ہوتا ہے۔ اچھا......وہ......وہ ڈائری تم نے پڑھی بھی؟''

سیما نے نظر چُرا لی ''ہاں...... میں نے بھی ایسی ڈائری بنا رکھی تھی، غزلیں، نظمیں اور......''

سیما یہ کہہ کر رکی تو رابو نے فوراً پوچھا ''اور......؟ اور کیا؟''

سیما ہنسی ''کچھ نہیں بس پاگلوں والی باتیں......''

رابو بھی مسکرائی مگر مسکراہٹ میں پھیکا پن تھا۔ رابو نے اپنے بچے کے گال چھوتے ہوئے کہا ''ہاں...... پاگلوں والی باتیں۔ ہم لڑکیاں بہت پاگل ہوتی ہیں۔ جوان ہوتے ہی اپنی ذات تلاش کرنے لگ جاتی ہیں، جب ہم سمجھتی ہیں کہ ہم بیٹیاں اور بہنیں ہیں، تو کچھ ہی عرصے میں محبوبہ کا روپ دھار لیتی ہیں، محبوبہ ہو کر ہم کیسی ہیں یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم بیویاں بن جاتی ہیں۔ بیوی سے ایک دن ماں...... ماں سے ساس...... کس رشتے کو قائم رکھیں، کسے چھوڑ دیں سمجھ میں نہیں آتا......اپنی ذات کی یہ تلاش کبھی ختم نہیں ہوتی۔''

سیما سنجیدگی سے اس کی بات سنتی رہی آنکھوں میں پانی بھرا ہوا تھا، پھر وہ بولی ''ہاں تم ٹھیک کہتی ہو۔ ہم ساری عمر اپنی تلاش میں گزار دیتی ہیں۔ اپنی ذات کو کھوجنے میں'' کچھ لمحے دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتی رہیں اور پھر سیما ایک ٹھنڈی آہ بھرنے کے بعد مدھم

آواز میں بولی ''میں تمہیں ڈائری لا دیتی ہوں''

سیما ڈائری لائی اور رابو کو مسکراتے ہوئے تھما کر چلی گئی۔ رابو نے بچے کو ایک طرف لٹا کر ڈائری کے اوراق پلٹے اور اپنی تحریر جو شادی کے تین دن پہلے لکھی تھی، کی آخری سطور پڑھتے ہوئے کچن کی جانب بڑھی

''آہ......ایک بار تو ضرور ملوں گی بھیا سے۔ چاہتی ہوں کہ جانے سے پہلے ایک بار ان کے گلے لگوں، سینے پر سر رکھ کر بہت دیر ان کے سینے کے بالوں کو اپنی انگلیوں سے سہلاتی رہوں۔ اور وہ مجھے بانہوں میں بھر کر کچھ دیر لیٹے رہیں۔ سب سے نظر چُرا کر چوری چوری ملنے کا مزہ ایک بار پھر سے لوں۔ وہ ہلکا ہلکا سا ڈر اور وہ گہرا سا سرور...... وہ ہونٹوں کی حدت، وہ بوسوں کا لمس...... پھر نجانے کب یہ موقع ملے۔ ملے گا بھی کہ نہیں...... کیا معلوم......'' رابو کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا...... یہ سطور پڑھتے پڑھتے رابو کچن میں داخل ہو چکی تھی، اس نے ڈائری سے نظر ہٹا کر دیکھا تو اس کے پیچھے ہی سیما بھی کچن میں داخل ہو رہی تھی۔ رابو نے نظریں چُرا لیں۔

''تم......!''

''ہاں میں...... کچھ کھانا ہے تو میں بنا دوں؟'' سیما نے مسکراتے ہوئے رابو سے پوچھا۔

''نہیں...... سیما......تم نے یہ ڈائری پڑھی...... کیا ساری پڑھی؟ شروع سے آخر تک؟'' رابو نے ڈائری کو اپنے دونوں ہاتھوں میں دباتے ہوئے سیما سے پوچھا۔

''ہاں...... پڑھی بھی اور سمجھی بھی۔ پڑھنے کے بعد کئی روز میں اس پر سوچتی رہی۔'' سیما رابو کے قریب آئی۔

''مگر کوئی بات نہیں کی...... کیوں نہیں کی؟ شاید تم بھی تو ایک عورت ہو، اس لیے...... مگر بڑی بھابھی بھی تو ایک عورت ہی ہے......''

رابو کی یہ بات سن کر سیما کی مسکراہٹ اور گہری ہوئی ''کیا بات کرتی؟ ہاں! عجیب ضرور لگا، بھیا......اور آشنا......مگر کیا کیا جا سکتا ہے؟ ہم لڑکیاں جب کسی کو دوست یا آشنا کہتی ہیں تو معاشرہ برداشت نہیں کرتا...... بھائی کا لیبل لگتے ہی سب پارسائی کی سند دے دیتے ہیں۔ کوئی بھی لڑکی، میرے جیسی لڑکی، تمہارے جیسی لڑکی......اپنے بھائیوں کو چھوڑ کر جب کسی کو بھائی بناتی

ہے، تو کبھی کبھی وہ بے وقوف خود نہیں جانتی کہ اصل میں اُسے پسند کرتی ہے...... ملنا بھی چاہتی ہے...... دوستی کرنا چاہتی ہے۔ اس سے بات کرنا چاہتی ہے۔ اس کے لیے ایک ایسے رشتے کا سہارا لینا پڑتا ہے جو معاشرے کو بھی منظور ہو...... اگر یہ پابندیاں نہ لگائی جائیں تو وہ اس مرد کو اپنا دوست یا آشنا ہی کہے...... بھیا نہیں...... بھائی تو صرف وہی ہوسکتا ہے جس نے ایک ہی ماں کے بطن سے جنم لیا ہو...... باقی تو پارسائی کے لیبل ہیں...... اور میں یہ بھی سمجھتی ہوں رابو کہ ہم کچھ تعلقات پاک نیت سے ہی بناتے ہیں، لیکن بعض اوقات حالات و واقعات اسے نازک موڑ پر لے آتے ہیں۔ میں نے کچھ نہیں پڑھا، پریشان مت ہونا "سیما نے پیار سے رابو کے گال پر تھپکی دی۔

رابو نے سیما کا وہی ہاتھ تھام کر چوم لیا...... اتنے میں بڑی بھابھی کچن میں داخل ہوئی......''اے...... سیما میری بہن وہ بچے...... اے لو...... رابو تجھے کیا ہوا؟ یہ تیری رونے کی عادت نہ گئی...... خیر! اچھا سیما سُن وہ بچے سکول سے آتے ہوں گے، انھیں کھانا تو کھلا دینا۔ میں ذرا حکیم صاحب سے دوائی لے آؤں......'' بڑی بھابھی خود کو چادر میں لپیٹتے ہوئے باہر نکل گئیں اور سیما بھی ان کے پیچھے پیچھے چل پڑی......

رابو نے ماچس کی ڈبیا میں سے ایک دیا سلائی نکال کر جلائی اور چولہے میں جھونک دی...... 'بھپ' سے آگ جلی ...... اس نے بہتے اشکوں کے ساتھ وہ ڈائری اس آگ پر رکھ دی...... چولہے کی آگ بڑھی...... کئی چنگاریاں ہوا میں بلند ہوئیں...... اور پھر بے وزن سی راکھ زمین پر اترنے لگی......

حرامزادہ رمضو

''حرامزادے رمضو کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ واردات کر کے کبھی اس نے کوئی نشان باقی نہیں رہنے دیا تھا۔اس روز جب وہ امام بارگاہ میں داخل ہوا تو گیٹ پر بیٹھا سکیورٹی گارڈ سو رہا تھا، جیسے ہی وہ امام بارگاہ کے پیچھے کوٹھڑی میں گھسا تو......''

شبیر حسین نے یہ کہہ کر پائپ میں سے جلے ہوئے تمبا کو کی راکھ کوایک طرف جھاڑا اور خالی پائپ کو منہ میں ڈال لیا۔

''وہ کوٹھڑی کے اندر کیسے گھس گیا؟'' سامنے بیٹھے بادامی آنکھوں والے نوجوان نے سوال اٹھایا۔

شبیر حسین نے پائپ منہ سے نکال کر ابرو سکیڑتے ہوئے کہا'' بے وقوف !میں نے بتایا تو ہے کہ چوکیدار سو رہا تھا۔''

تمبا کو سے خالی پائپ شبیر حسین کے ہونٹوں کے ساتھ حرکت کر رہا تھا،اس کے بالکل سامنے بیٹھے نوجوان کی بادامی اور بڑی آنکھیں ہر حرکت کا بغور جائزہ لے رہی تھیں۔ کمرے میں دوموم بتیاں جل رہی تھیں جن کی مدھم روشنی نیم تاریکی کو سفید دیواروں پر نچا رہی تھی۔ کچھ توقف کے بعد شبیر حُسین نے سامنے پڑی لاٹھی اٹھا کر اس کے سرے کو باریکی سے دیکھتے ہوئے بات کو آگے بڑھایا؛

''کوٹھڑی کے اندر داخل ہو کر اس نے سب سے پہلے الماری پر ہاتھ ڈالا۔ گلے میں سے سارا چندہ اکٹھا کیا۔ بابو بھی سو رہا تھا۔نجانے اس دن کیسے آنکھ لگ گئی، ہوسکتا ہے گردہ زیادہ پی لیا ہو۔

نوحہ خوانی تھی نا دن بھر۔ خوب نذرانہ اکٹھا ہوا تھا۔ ایسے موقعوں پر وہ ایک پکا سگریٹ لگا لیا کرتا تھا اور بہت ماتم کرتا تھا۔ کوئی آگے نہ پیچھے بس امام بارگاہ کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ بہت بڑا ماتمی تھا بھئی۔''

شبیر حسین نے اپنے ہونٹ اوپر کی جانب اٹھائے تو اس کی بھاری مونچھوں میں ناک دھنس گئی۔

''پیسے اٹھانے کے بعد رمضو نے بہت سہولت کے ساتھ وہاں سے باہر نکلنے کا بھی انتظام کر لیا۔''

بادامی آنکھوں والا لڑکا شبیر حسین کے چہرے کی جانب بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے وہ الفاظ کی ادائیگی سے پہلے ہی کہانی کا انت جاننے کی کوشش کر رہا ہے۔

''اس زمانے میں لوگ بہت چندہ دیتے تھے، بڑے بڑے تاجر، سرمایہ کار، کاروباری، سرکاری نوکر۔ ہر مہینے کے شروع میں ہی ہزاروں روپے امام عالی مقام کی بارگاہ میں جمع کرواتے تھے۔ سال کے بارہ مہینے خوب نیازیں چلتی تھیں۔ لنگر میں مرغ مسلّم روغنی نان، پلاؤ بریانیاں، بہت اعلیٰ انتظام ہوتے تھے۔ دن بھر امام بارگاہ میں رونق لگی رہتی تھی۔ باہر پکی پکائی دیگوں والے بھی تھے۔ جن لوگوں کے پاس وقت نہیں ہوتا تھا وہ انہیں پیسے دے دیا کرتے تھے اور دیگوں والے خود ہی دیگیں بانٹتے تھے۔

ظالم کے بچے بارہ کلو کی دیگ کے پیسے لیتے تھے اور بانٹتے چھ آٹھ کلو ہی تھے۔ میں اور وہ حرامزادہ رمضو۔ دونوں پیٹ بھر کے لنگر کرتے تھے۔ کبھی بھوکے نہیں رہے تھے۔ ہاں لیکن اس رمضو کی ماں تو سیدانی تھی نا۔ بہت سخت پردہ کرتی تھی۔ خود باہر نکلے نا ہی رمضو کی چھوٹی بہن کو نکلنے دے۔ اکثر ہی رمضو ان کے لیے تبرک لے جاتا تھا، کبھی کبھی نہیں بھی ملتا تھا۔ نجانے پھر کیا کرتے ہوں گے۔ اس عورت نے بہت سخت وقت کاٹا تھا۔ وہ تو گھروں میں کام کرنے کو بھی تیار تھی۔ پر سب کو اعتراض تھا کہ سیدانی سے گھر کا کام کروائیں؟ دوسرا سیّد برادری کے طعنے بھی تو تھے۔ بیچاری نے بہت دکھ اٹھائے زندگی میں۔''

شبیر حسین نے ایک سرد آہ بھری اور سر لٹکا کر لاٹھی کو دیکھنے لگا۔ بادامی آنکھوں والے لڑکے کو بے چینی سے انتظار تھا کہ بات آگے بڑھے، اس بے چینی میں اس کی ایک ٹانگ مسلسل

حرکت میں تھی۔لیکن شبیر حسین کا رعب اتنا تھا کہ وہ اس سے پوچھ نہیں پا رہا تھا کہ "پھر کیا ہوا؟"

لڑکے کے اندر بے پناہ تجسس کروٹیں لینے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس نے کبھی شبیر حسین کو اتنا غمگین نہیں دیکھا تھا۔

ہوا کچھ یوں تھا کہ دو دن پہلے دروازے پر دستک کی آواز سُن کر اسی بادامی آنکھوں والے لڑکے نے دروازہ کھولا تو دائیں بغل میں بیساکھی دبائے ایک بوڑھا شخص کھڑا تھا۔ گھٹنے سے نیچے دائیں ٹانگ کٹی ہوئی تھی۔

اس نے بچے کو دیکھا تو پوچھا ''شبیر حسین ہے؟'' بادامی آنکھوں والے لڑکے نے سر ہلایا اور اسے اندر آنے دیا۔داخل ہوتے ہی اس نے دوسرا سوال کیا ''تم اس کے پوتے ہو؟'' بادامی آنکھوں والے لڑکے نے ناں میں سر ہلا دیا۔''آپ بیٹھیے میں سر جی کو بتا کر آتا ہوں۔'' اس کے بعد جب اس نے شبیر حسین کو بتایا تو وہ اپنی بیٹھک میں چلا آیا۔کچھ پل کے لیے شبیر حسین اس اپاہج کا چہرہ دیکھتا رہا، بوڑھی آنکھیں اس ویران چہرے کو پڑھنے کی کوشش کرتی رہیں...... پھر اس کی نظر ٹانگ پر پڑی تو اس کے ہونٹوں میں جنبش پیدا ہوئی ''رمضو؟ اوئے حرامزادے......توں؟ اوئے کہاں مر گیا تھا؟'' یہ کہہ کر شبیر حسین اس کی طرف بڑھا اور گلے سے لگا لیا۔دونوں کچھ دیر ایک دوسرے کے ساتھ لپٹے رہے۔اپاہج کو اب بیساکھی کی ضرورت نہیں تھی سو وہ ایک طرف گر گئی۔شبیر حسین نے اسے صوفے پر بیٹھایا اور بادامی آنکھوں والے لڑکے سے کہا کہ جا کر رمضو کے لیے پانی لے آئے۔

مشروب،عمدہ قسم کا کھانا، چائے کے ساتھ زندگی کے بھربھرے اور پیلے صفحوں کی الٹ پلٹ چلتی رہی......جن صفحوں پر کہیں قہقہے لکھے تھے کہیں افسردگی۔ پڑھتے پڑھتے شام ڈھلتی گئی۔شام سے پھر رات۔

اُس رات جب شبیر حسین رمضو کو بستر پر لٹا کر گیا تو اگلی صبح اسے کمرے میں نہ پایا...... تب سے شبیر حسین پریشان تھا اور بادامی آنکھوں والا لڑکا متجسس۔

شبیر حُسین گہری سوچ کے گرداب میں سے باہر نکلا تو شاید عمر کا تقاضہ تھا کہ شبیر حسین بات بھول چکا تھا؛

''ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا؟''

بادامی آنکھوں والے لڑکے نے جواب دیا''رمضو صاحب کی والدہ کے بارے میں کچھ کہہ رہے تھے آپ۔''

''ہاں ہاں۔ بے چاری۔ بہت صابر عورت تھی۔ رمضو کا باپ سر پر نہیں تھا۔ پہلے تو میرے ساتھ سکول پڑھتا رہا اس کے بعد آوارہ ہوگیا۔ چھوٹی موٹی چوری چکاری بھی کرنے لگا، میں بھی اس سے کنی کترانے لگا تھا۔ میں نے میٹرک مکمل کر لی تھی۔ اس کے بعد کالج کا وقت آیا تو میرے ماں باپ کے پاس اتنے پیسے نہ تھے کہ آگے پڑھاتے۔ ایک سائیکلوں والی دکان تھی۔ وہاں شام کو کام کرنے لگا صبح کالج۔ کسی نہ کسی طرح گزارہ چل پڑا۔ لیکن کالج میں پڑھائی اچھی رہی تو مجھے یونیورسٹی کا شوق پڑ گیا۔ ذہن بن گیا تھا کہ آگے ہر حال میں پڑھنا ہے اور وہ بھی یونیورسٹی سے۔ ہمارا گاؤں جہلم کے پاس تھا۔ اسلام آباد میں بہت ساری یونیورسٹیاں تھیں۔ آتے جاتے لڑکوں کو دیکھ کر بہت جی مچلتا۔ یونیورسٹیوں کے قصے کہانیاں سنتا۔ یہ بھی جانتا تھا کہ یونیورسٹیاں ہم جیسوں کے لیے نہیں ہوتیں۔ لیکن جب کالج میں سے اچھے نمبروں کی امید تھی تو یونیورسٹی کا جنون میرے سر پر سوار ہو چکا تھا۔ پتہ یہ چلا کہ داخلے کے لیے ہزاروں روپے چاہییں۔ اور پھر ایک بار کا رونا بھی تو نہیں تھا ہر سال کی فیس اتنی تھی کہ سوچنا بھی ناممکن سا لگتا تھا۔ ایک غریب کا بچہ تو ڈھنگ کی تعلیم بھی نہیں حاصل کر سکتا، تعلیم نہیں ہوگی تو نوکریاں خاک ملیں گی'' شبیر حسین نے پائپ میں تمبا کو ڈالا اور دیا سلائی جلا کر اسے سلگانے لگا۔

''پر سوچ کہاں ٹلتی ہے۔ میں اپنے گاؤں کے بہت گندے اور گہرے نالے کی پلی پر بیٹھا تھا اور یونیورسٹی کی سوچ کسی مکھی کی طرح میری آس پر منڈھلا رہی تھی اتنے میں یہ رمضو آ گیا اور ہمیشہ کی طرح بک بک کرنے لگا'' شبیر حسین کے بوڑھے چہرے پر مسکراہٹ ابھری۔

شبیر حسین کی کہانی میں مگن بادامی آنکھوں والا لڑکا بھی مسکرا دیا۔

''خیر۔ رمضو کو میں نے ساری پریشانی بتائی تو میری سوچ کی مکھی اس کے منہ کے سامنے بھی بھنبھنانے لگی۔ وہ ایسے ذہن لڑانے میں مصروف ہو گیا جیسے بیٹھے بیٹھے ہزاروں روپے میری جھولی میں ڈال دے گا۔ اور پھر اچانک اچھل کر بولا......امام بارگاہ ہے نا۔''

''ہاں ہے تو سہی۔ لیکن امام بارگاہ ایسے کاموں کے لیے تھوڑی بنی ہے؟ وہ مولا کی عبادت کے لیے ہے۔''

''اوئے مولا ہی سب کو دیتا ہے۔''
''مگر کیسے؟''
''وہ میرا کام ہے نکالنا۔'' رمضو کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھ کر میں اس کی تدبیر سمجھ گیا تھا۔
میں نے اسی وقت اس سے کہہ دیا کہ یہ گناہ ہے پر رمضو حرامزادہ کہاں ٹلتا تھا۔ بولا؛
''او یارا کیا گناہ ہے؟ کیا جرم ہے؟ یہ لوگ چندوں سے مسجدوں، امام بارگاہوں، درباروں کے گلے بھرتے ہیں۔ کیا انہیں ہم جیسے لوگوں کے گھروں میں پڑی آٹے کی خالی پیٹیاں نظر نہیں آتیں؟ دیگیں پکا کر بریانی مرغ کی پلیٹیں بانٹتے ہیں۔ کیا انہیں گھروں میں بھوکے پیٹ سوئے بچے نظر نہیں آتے؟ ان لوگوں کے لیے خیرات کرتے ہیں جو موجود نہیں۔ لیکن ہم جیسے بھوکے اور ننگے لوگ ان کی آنکھوں کے سامنے جیتے جاگتے نظر نہیں آ رہے؟ بھئی کہتے ہیں نا مولا دیتا ہے ہم بھی تو مولا سے لے رہے ہیں۔ اسی گلے میں سے وہ بین چو بابو پیسے نکال کر چرس کے پکے سگریٹ پی سکتا ہے تو تو نیک کام کے لیے پیسے نہیں لے سکتا......؟''
میں اس کی بات سُن کر بالکل ساکت سا ہو گیا تھا، رمضو کی ہر بات سچ سہی۔ لیکن گناہ کا احساس تو میرے اندر اُسی طرح تھا۔ سو میں نے ایک مرتبہ پھر رمضو سے کہا؛
تو کیا ہم امام بارگاہ میں چوری کریں گے؟
''اوئے کھوتے۔ ہم نہیں۔ میں کروں گا، میرے تو گھر کی بات ہے۔''
میرے اندر کی حیرانی چہرے پر آ گئی میں نے اس کے قریب ہو کر اسے کہا ''تُو سیّد ہو کر چوری کرے گا؟'
وہ اپنے مخصوص شوخ انداز میں بولا'' کیوں سیّد انسان نہیں ہیں؟ انسانوں کی طرح ہنستے ہیں، روتے ہیں، گاتے ہیں، ناچتے ہیں، شراب پیتے ہیں، کھاتے ہیں۔ چوری نہیں کر سکتے؟''
یہ کہہ کر رمضو نے قہقہہ لگایا تھا اور مجھے اس کے قہقہے میں پہلی مرتبہ انسانیت کی جھلک نظر آئی تھی۔ میں تو اسے بگڑا ہوا اور آوارہ لڑکا سمجھتا تھا لیکن اس کی باتوں اور خلوص کے سامنے مجھے یہ دنیا ٹیڑھی لگی تھی۔ آوارہ۔ بدچلن سی۔ غافل دنیا۔ وہ دنیا جس نے رمضو کے اس گناہ کی سزا خود طے کر لی۔''

شبیر حسین کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔

''رمضو نے مجھے پیسے دے کر اسلام آباد بھیج دیا۔ ابھی پانچ مہینے گزرے تھے کہ میری ماں دنیا سے اپنی غریبی کی گٹھڑی اٹھا کر چل پڑی...... پیچھے پیچھے ابا جی بھی...... دونوں کی موت میں تین مہینوں کا وقفہ تھا...... میرا جی دنیا سے کچھ ایسا اٹھا کہ میں نے گاؤں جانا چھوڑ دیا...... کام بھی کرتا رہا، پڑھتا بھی رہا...... دین دنیا کا کوئی ہوش نہیں تھا...... پیسوں کے لیے جگہ جگہ کھپنا...... پر پھر بھی ہر روز سوچتا کہ رمضو تو نے میری زندگی بنا دی...... ایک بار میرے ہاتھ ڈگری آ جائے تو پہلی مٹھائی تجھے کھلاؤں گا۔ اور میرا تھا بھی کون......''

شبیر حسین جیسے جیسے کہانی کو آگے بڑھا رہا تھا چہرے پر کرب اور گہرا ہوتا جا رہا تھا۔

''آخر وہ دن بھی آیا کہ مجھے ڈگری مل گئی...... سب سے پہلا خیال رمضو کا تھا...... جب گاؤں گیا تو وہاں کچھ بھی نہیں تھا...... کسی نے بتایا کہ رمضو بہت دیر کا گاؤں چھوڑ کر جا چکا...... کہتے ہیں چوری کرتے پکڑا گیا تھا...... امام بارگاہ سے چوری...... جس دن پکڑا گیا اس حرامزادے نے اتنی مار کھائی...... ٹانگ تڑوالی...... پر یہ نہیں بتایا کہ وہ پیسے اس بارکس کو پڑھانے کے لیے چرا رہا تھا...... ٹانگ ٹوٹی تو اسے ہسپتال لے گئے جہاں سے وہ اگلے دن غائب ہو گیا......

شبیر حسین نے یہاں تک ہی کہا اور پھر لاٹھی کے سر پر اپنا ماتھا ٹیک دیا۔

''اور جب...... اور جب اتنے سال کے بعد سامنے آیا ہی تو کیا کہہ دیا تھا اسے......؟ یہی نا کہ اب تُو کہیں نہیں جائے گا...... میرے پاس رُکے گا...... یہ سب جو کچھ ہے تیری وجہ سے ہے...... اب کہیں جانے کی ضرورت نہیں...... پر وہ کہاں سنتا ہے کسی کی...... کھوتا...... صبح ہوتے ہی بغیر بتائے دفع ہو گیا......''

شبیر حسین کا چہرہ بھیگا ہوا تھا۔

ہاتھ میں تھامی لاٹھی لرز رہی تھی۔

اور ہونٹ الفاظ کے ختم ہونے کے باوجود کچھ بڑبڑا رہے تھے۔ جیسے کہہ رہے ہوں

''حرامزادہ رمضو۔''

بادامی آنکھیں بھی پانی کی وجہ سے دھندلا گئی تھیں...... اسی دوران آنسو ٹپکا تو لڑکے نے اپنی قمیض کی جیب کی طرف دیکھا جس میں سے وہ چند روپے بھی خاموشی سے کہانی سُن رہے

تھے، جو شبیر حسین نے اُسے کالج کی فیس کے لیے دیے تھے......ادھر دولرزتے شعلے بالکل ساکت ہوکر جلتے جا رہے تھے...... کمرے کی نیم تاریکی ابھی کچھ اور سننے کو بے تاب تھی......مگر خاموشی رہی...... کچھ دیر کے لیے خاموشی رہی اور پھر شبیر حسین نے اسی روہانسی آواز میں رُک رُک کر بولنا شروع کیا؛

''میرے پہلے داخلے......اورایک سال کی فیس کی قیمت میں......رمضو نے اپنی ٹانگ ادا کی......اپنے گھر سے بے گھر ہوا......اوراتنے سال گزار کر اب صرف یہ دیکھنے آیا تھا کہ کیا

اس کی ٹانگ......اس کا گاؤں......اس کا گھر اور......

اس کا گناہ......کہیں رائیگاں تو نہیں گئے؟''

تعلّق

میں ٹیکسی کو پارکنگ میں لگانے کے بعد بینچ پر بیٹھ کر بَبیر کاٹن ہاتھ میں لیے آتے جاتے ہر طرح کے لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ نوجوان، بوڑھے اور کچھ ایسے جو جوانی کو خیر باد کہہ رہے تھے، ان سب کے چہرے الگ، چہروں پر تاثرات الگ اور یقیناً ہر ایک کی کہانی بھی الگ......

کوئی مستقبل کا اضطراب لیے تھا، کسی کو ماضی جکڑے ہوئے تھا اور کوئی حال کی تیز رفتار زندگی کے ماتحت روبوٹ جیسا سپاٹ چہرہ لیے چلا جا رہا تھا۔ میری نظر سے بہت کم لوگ ایسے گزرے جو ماضی، حال یا مستقبل کے کُھلکوں سے بے نیاز پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ٹھونسے، چہرے پر اطمینان و سکون لیے ٹہل رہے ہوں۔ شاید ان پُرسکون خوش نصیب لوگوں میں تو مَیں بھی شامل نہیں تھا۔ میں تو تینوں زمانے اپنے ناتواں کندھوں پر لادے بیٹھا تھا، یہ بھی خیال نہ رہا تھا کہ ہاتھ میں تھاما بَبیر کا ٹھنڈا ٹن گرم ہو چکا ہے۔ اور نجانے کب تک ایسے بے وجہ بیٹھا رہتا اگر مجھے فون پر ہیری سن سے سواری اٹھانے کے لیے نہ کہا جاتا۔

مجھے ایک سواری کو ہیری سَن سے نیو یارک سٹی پہنچانا تھا۔ طبیعت اتنی بوجھل ہو رہی تھی کہ بالکل بھی جی نہیں چاہ رہا تھا لیکن جیب مجھے آنکھیں دکھا رہی تھی اور گھریلو ضروریات نے بھی گھنٹی بجائی تو مجھے اپنے جسم میں طاقت محسوس ہوئی جس کے بل بوتے پر میں اٹھ کر پارکنگ کی جانب بڑھنے لگا۔

جب ''بی 332'' پر پہنچا تو وہ پہلے سے دروازے پر موجود تھی۔ اس نے ٹیکسی کو دیکھتے ہی اپنا بیگ کاندھے سے اتارا اور پچھلا دروازہ کھول کر خود کو سیٹ پر گرا لیا۔ بیگ دوسری طرف رکھا تو میں نے بیک ویو مرر میں سے دیکھتے ہوئے پوچھا ''چلیں میڈم......؟'' وہ چونک گئی......میرے

سوال کا جواب دینے کی بجائے اس نے کہا ''پاکستانی ہو؟'' میں نے مسکراتے ہوئے سر ہلا دیا اور ٹیکسی روڈ کی طرف گھما لی۔ کچھ ہی فرلانگ کے فاصلے پر اس نے سوال کیا ''تمہیں کیسے پتہ تھا کہ میں بھی پاکستانی ہوں؟''

''جی مجھے یہ تو پتہ نہیں تھا، ابھی آپ نے بتایا۔''

''تو پھر اردو میں بات کس لیے کی؟'' اس کی آنکھوں میں سوال اور ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

''کیوں کہ آپ مجھے انڈین یا پاکستانی لگیں۔''

''اچھا......؟ میرے بارے میں ایسا اندازہ کیسے لگا سکتے ہو؟''

میں نے پیچھے کی جانب سر گھما کر اس پر ایک نگاہ ڈالتے ہوئے کہا ''آپ کی آنکھوں میں لگا کاجل دیکھ کر......آپ کے کالے بال......اور چہرہ......''

اس نے مسکراتے ہوئے سر جھٹکا اور اپنے بیگ کو گود میں رکھ کر کچھ ٹٹولنے لگی۔

''کافی چالاک لگتے ہو تم۔''

''نہیں ایسا تو نہیں...... یہ تو صرف ایک اندازہ تھا۔'' میں نے مختصر سا جواب دیا۔

''ہوں......ٹھیک نشانے پر لگے تو ٹھیک اندازہ......ویسے غلط بھی ہو سکتا ہے'' اس نے کاندھے اچکائے۔

''جی جو غلط ہوتا ہے وہ تو اندازہ ہے ہی نہیں......وہ تو غلط فہمی ہے۔'' میں نے سگنل پر گاڑی روکتے ہوئے اسے بے تکا سا جواب دیا، لیکن مجھے امید نہ تھی کہ وہ اس بے تکے جواب کو بھی سراہے گی۔

''واہ...... بہت وٹی ہو......کوئی اچھی جاب مل جانی چاہیے۔''

''یہ بھی تو اچھی ہے۔ اس میں کیا بُرا ہے؟''

''بُرا تو کچھ بھی نہیں ہے۔ بے آرامی تو ہے نا۔'' اس نے پھر ایک مرتبہ کاندھے اچکا کر بات کی۔

میں نے ٹیکسی چلانے کا جواز کچھ ایسے دیا کہ "میڈم یہ سب سے اچھی اور آرام دہ جاب ہے۔ میرے جیسا بدمزاج کسی کے ماتحت کام کر ہی نہیں سکتا۔ جی چاہتا ہے سواری اٹھا لیتا

ہوں نہ چاہے تو معذرت کر لیتا ہوں ۔ کم از کم کوئی مجھ پر حکم تو نہیں چلا سکتا ۔"

ابھی یہ بات میرے منہ سے نکلی ہی تھی کہ پچھلی سیٹ سے اس کی آواز آئی ۔

"Stop stop for a while"

میں نے گاڑی کی بریک دبائی لیکن ابھی گاڑی کی رفتار کچھ ہی کم ہوئی تھی کہ اس نے ہنستے ہوئے کہا

''ارے چلاتے رہو......روک کیوں رہے ہو؟''

''کیوں کہ ابھی آپ نے کہا۔''

اس کے چہرے کی مسکراہٹ شرارت میں بدل گئی اور میں بھی بات سمجھ گیا۔ دونوں مسکراتے ہوئے اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھے ۔ اس کا ہر انداز مجھے بہت بھلا لگ رہا تھا۔ مسکراہٹ میں ایک گہرائی تھی، آنکھوں میں ایک چمک سی تھی ۔ جیسے وہ اپنے تاثرات کے ساتھ کئی باتیں کہہ جاتی ہو۔ میں نے بیک ویو مرر اس کے چہرے پر ٹکا دیا تھا۔

اس دوران ہماری باتوں کا دلچسپ سلسلہ تھوڑی دیر کے لیے بھی منقطع نہ ہوا۔ اس سے بات کر کے مجھے اچھا محسوس ہو رہا تھا، ایسا لگتا تھا کہ جیسے کوئی اپنی ہو۔ اس کی بڑی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ ایک تو ہم زبان تھی اس کے علاوہ اس نے بالکل بھی احساس نہیں دلایا تھا کہ مجھ سے جھجک رہی ہے ۔ پاکستانی لڑکیوں میں جیسا روایتی پن ہوتا ہے وہ مجھے اس میں بالکل بھی نظر نہ آیا تھا۔

میں محسوس کر رہا تھا کہ میری اس سے غیر معمولی بات چیت ہو رہی تھی، ٹیکسی چلاتے ہوئے مجھے دو سال ہو چکے تھے لیکن آج تک اتنے نارمل طریقے سے نہ میں نے کسی کو ٹریٹ کیا تھا نہ ہی مجھے کسی نے ۔

میں نے ایسے لوگ بھی دیکھے جو آپس میں لڑتے ہیں، قہقہے لگاتے ہیں، فون پر باتیں کرتے ہیں ۔ میں سب کو بیک ویو مرر سے دیکھ کر کئی کہانیاں کشید کر سکتا ہوں لیکن مجھے آج تک اتنا انٹرسٹ کسی میں بھی محسوس نہیں ہوا۔ گھر سے دور رہ کر اکثر تنہائی میں جی بھی کرتا تھا کہ کچھ بولوں، کسی سے کچھ کہوں......کئی سواریاں مجھ سے بات چیت بھی کرتی تھیں لیکن میری خشک طبیعت دیکھ کر چپ ہو رہتیں ۔ لیکن اس مرتبہ کچھ الگ تھا۔ میں سب کچھ کہتا چلا جا رہا تھا۔ مجھے اپنے آپ پر بھی حیرانی تھی ۔ سو باتوں کا یہ سلسلہ دلچسپ لگ رہا تھا۔ کچھ پتہ بھی نہ چلا کہ ہم نیویارک پہنچ چکے تھے ۔

''ویسے تمہاری واپسی کب ہے؟'' پچھلی سیٹ سے اس کی آواز آئی۔

''جی یہی کوئی شام چھے بجے۔'' میں نے زیادہ وقت کا مارجن رکھ کر بتایا کہ اگر وہ واپس میرے ساتھ جانا چاہے تو اچھے سفر کا ایک اور موقع مل سکتا تھا لیکن دوسری طرف خاموشی رہی تو میں نے کچھ انتظار کے بعد اس سے کہا۔

''اگر آپ کو جلدی یا کچھ دیر سے نکلنا ہے تو میں مینج کر سکتا ہوں۔''

''میں شاید چار بجے فری ہو جاؤں۔ لیکن......''

''لیکن......؟''

''لیکن یہ کہ اس وقت میں ساڑھے پانچ والی ٹرین بھی پکڑ سکتی ہوں......اور دوسرا لیکن یہ کہ اسٹیشن تک جانے کی ہمت کہاں رہے گی......'' اس کے کھلے ہوئے چہرے پر تھکان سی امنڈ آئی۔

اس دن طے یہی ہوا کہ ہم اکٹھے نیوجرسی واپس جائیں گے اور گئے بھی۔ راستے میں ایک پل کے لیے بھی خاموشی نہیں رہی، وہ ایک سیمینار سے واپس آ رہی تھی اس نے ساری روداد سنا ڈالی۔ یہاں تک کہ اسے اپنی باس کے کپڑے بُرے لگے، ایک گنجے نے اس پر لائن مارنے کی مسلسل کوشش کی اور وہ اس کے ہاتھ نہ آئی جیسی عام باتیں بھی بتاتی رہی۔ اور میں بیک ویو مرر سے اسے دیکھتا رہا۔ وہ بہت بارونق چہرے والی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک سکون سا تھا۔ اور ہنسی میں کچھ ایسا تھا کہ میری نظر بار بار اس کا ہنستا چہرہ دیکھنے کے لیے بہک جاتی۔ میں بھی جتنا بولنا چاہ رہا تھا وہ بول ہی رہا تھا۔ مجھے اس نے بتایا کہ یہ سیمینار اگلے چار روز مزید چلے گا۔ گھر پہنچ کر وہ گاڑی سے اتری تو چلتے چلتے رک گئی پلٹ کر دیکھا تو میں اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

''کیا تم کل بھی مجھے پک کر سکتے ہو؟ اِن فیکٹ کل بھی یہی ہوگا کہ میں ٹرین نہیں پکڑ سکتی اور جلدی پہنچنا ہے۔''

''جی جی کیوں نہیں، میرا تو کام ہی یہ ہے۔''

''اوکے تو ڈن......پھر آج صبح والے وقت سے پندرہ منٹ پہلے پہنچ جانا۔''

اگلے دن دوبارہ گھر کے سامنے پہنچا تو ہارن بجانا پڑا کیوں کہ وہ باہر نہیں تھی۔

''ہیلو......کیسے ہو؟ بہت وقت پر پہنچے ہو۔''

''جی ڈیوٹی جو ہوئی۔''

مجھے نیوجرسی میں رہتے ہوئے دوسال کے قریب ہو چکے تھے۔مگراس دوران ایک پل بھی میں نے اتنا بارونق نہیں دیکھا تھا، یہ سب زندگی سے بھرپور تھا۔جس میں ہم ایک دوسرے کے ساتھ کچھ بھی شئیر کر سکتے تھے۔کسی بھی موضوع پر کھل کر بات کر سکتے تھے۔میں نے اسی دوران محسوس کیا کہ میں کتنی زیادہ اونچی آواز میں قہقہے لگا رہا ہوں۔دو دن سفر کے دوران آتے جاتے بہت کچھ کہنے اور سننے کو تھا، بلکہ دوسرے روز تو اس نے اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں بھی بتایا۔کیا اچھا لگتا ہے کیا بُرا ہم دونوں نے اس پر بات کی۔پاکستانی انڈین گانے فلمیں......شاید ہی کچھ ایسا ہو کہ جس پر بات نہ ہوئی ہو۔

اور تیسرے دن میں حیران تھا جب اس نے مجھے نیویارک پہنچنے سے کچھ پہلے کہا کہ وہ سیمینار اٹینڈ نہیں کرنا چاہتی، وہ چاہتی تھی کہ دن کہیں گھوم کر گزارا جائے۔خوب باتیں ہوں کچھ کھایا پیا جائے۔سو ہم نیویارک کی کئی جگہوں پر گھومتے گھماتے ایک چھوٹے سے ریسٹورنٹ میں آ کر بیٹھ گئے۔مختلف باتیں ہونے کے بعد ہم تعلق کے موضوع پر بات کرنے لگے۔

اس نے کافی سنجیدہ انداز میں کہنا شروع کیا

’’تعلق بنانے سے نہیں بنتے جبکہ رشتے ہم بنا لیتے ہیں اور کچھ ہماری ذات کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پیوست ہو جاتے ہیں۔آہ......ہم کتنے بدنصیب ہیں کہ ہم چاہیں بھی تو ایسے ان چاہے رشتوں سے الگ نہیں ہو پاتے۔‘‘

’’مجھے تو تعلق اور رشتے میں کوئی فرق نظر نہیں آتا......ویسے بھی میں سمجھتا ہوں کہ رشتے ہی زندگی کا حاصل ہیں۔‘‘

’’اف......‘‘ میری بات سُن کر اس کی پیشانی پر بل نمودار ہوئے’’ہم ہمیشہ زندگی سے کچھ حاصل کرنا ہی کیوں چاہتے ہیں؟ کیا زندگی بذاتِ خود ایک ماحصل نہیں ہے؟ اس میں رنگ ہیں، رونقیں ہیں، بہاریں ہیں، ہنسنا رونا سب کچھ ہے......اور کیا چاہیے؟ ہم ضرورت کا ٹیگ لگا کر ہر ایک شے کو محدود کیوں کر دیتے ہیں؟ معیار کیوں مقرر کر دیتے ہیں؟ اصل حُسن کی تباہی تو یہی ہے۔‘‘

اس کی باتیں سننے کے بعد میں خاموش تھا اور فقط اسے دیکھ رہا تھا، اسے سن رہا تھا......اور اس کی ذات کے اندر جھانکنے کی پوری کوشش میں تھا۔اس دوران اس نے میری خاموشی کو

دیکھتے ہوئے مجھے کہا بھی کہ آج اتنا خاموش کیوں ہو۔ کیا جواب دے سکتا تھا کہ میں تو خود اس کیفیت کو سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

میرے اندر کے اکیلے پن کو ایک تسکین سی ملی تھی، ایک عجیب راحت محسوس کر رہا تھا۔ ایک مرتبہ تو جی میں آیا کہ میں اسے کہہ دوں......لیکن پھر اس ڈر سے چپ رہا کہ شاید وہ میرے جذبات کو ٹھیک طرح سمجھ نہ پائے اور اسے میری یہ بات ناگوار گزرے، سو خاموشی میں ہی عافیت جانی۔ ابھی میرے پاس کچھ بھی کہنے کے لیے ایک اور دن تھا اگر نہیں تو آنے والے وقت میں کئی موقعے مل سکتے تھے۔ جو بھی تھا لیکن اتنا تو میں جان چکا تھا کہ میں اس کی جانب بھرپور انداز میں جھک چکا تھا۔ ماضی، حال اور مستقبل ان سب کا بوجھ اتار کر کہیں دور رکھ دیا تھا۔ ریسٹورنٹ پر بیٹھے میری خاموشی کو دیکھتے ہوئے وہ بھی خاموش ہو چکی تھی۔ پھر اس نے اچانک کہا؛

''ہمیں چلنا چاہیے۔''

''لیکن ابھی تو شام ہونے میں کافی وقت پڑا ہے۔''

اس نے میری بات پر توجہ نہ دی اور بیگ اٹھا کر ریسٹورنٹ سے باہر نکل آئی۔ میں بھی اس کے پیچھے چل پڑا۔ ہم دونوں ٹیکسی میں سوار ہو کر نیوجرسی کی جانب بڑھنے لگے۔

''میں اکثر سوچتی ہوں کہ جہاں بھی نظر دوڑا کر دیکھ لیں، ہر شخص کسی ضرورت کے تحت ہمارے ساتھ جُڑا ہوتا ہے۔''

اس نے ہمارے درمیان حائل بدمزہ سی خاموشی کے بیریئر کو توڑتے ہوئے کہا۔

''اکثر پیار اور خون کی بنیاد پر قائم رشتے بھی ضرورت پر......ضرورت مادی نہ سہی جذباتی یا جسمانی سہی......لیکن ضرورت تو ہے۔ ہم انھیں حوصلہ دیں، ان کا خیال رکھیں۔ یہ بھی تو ایک ذمہ داری ہے'' اس نے لفظ ذمہ داری پر زور دیا۔ اور بولنا جاری رکھا'' کام ہے......ٹاسک ہے......تو رشتہ پھر دراصل ہے کیا؟ اور اگر ہم ایسی توقع کسی سے رکھیں تو ہم نے بھی اسے ایک کام ہی سونپ دیا۔ کیا ایسا نہیں ہے؟''

''مگر کچھ رشتے ایسی ضروریات سے ماورا بھی ہوتے ہیں۔'' میں نے بھی سنجیدہ ہو کر جواب دیا۔

'' وہ محض تعلق ہی ہوتے ہیں۔ رشتے نہیں۔ کیوں کہ رشتہ بنتے ہی کوئی نہ کوئی فرض یا

ضرورت در آتی ہے۔ ہر رشتہ قائم ہوتے ہی حقوق و فرائض کی ایک لمبی لسٹ ساتھ لے کر آتا ہے...... جسے ہم عمر بھر نبھاتے رہتے ہیں......صرف سادہ اور سیدھے تعلق عظیم ہیں۔ معتبر ہیں...... لیکن ہیں کہاں؟''

میں نے مڑ کر ایک نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی، وہ بالکل سنجیدہ تھی ''نہیں۔ اتنی بھی حقیقت پسند بن کر زندگی کے حُسن کو تباہ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟''

''میں اور تم دو دن سے باتیں کر رہے ہیں......ڈھیر ساری باتیں......کیوں؟''

''آپ بتائیں گی تو بہتر بتا دیں گی۔''

''کیوں کہ مجھے بات کر کے اچھا لگتا ہے۔ اس میں نہ کوئی ضرورت ہے نہ مجبوری۔ اور نہ ہی تسلی دلاسہ دے کر عظیم بننے کی کوشش......اس تعلق کو ضرورتوں اور غرض کے کسی بھی خانے میں کیسے رکھ سکتے ہیں؟ تمہیں پتہ ہے اگر اس تعلق میں بھی کوئی رشتہ ہوتا تو یہ بھی ایک ضرورت میں بدل جاتا۔ کتنا بدنما بھدا...... پھیکا اور بکواس بن کر رہ جاتا۔''

'' ایسا نہیں بھی ہوتا...... یوں کیا ملتا ہے آپ کو ہر چیز میں کوئی غرض تلاش کر کے؟ ایسی سوچ کے ساتھ تو انسان بالکل خالی ہاتھ رہ جائے......''

اس نے مر مر میں سے میری آنکھوں میں دیکھنا شروع کیا۔ جیسے اس کے پاس الفاظ ختم ہو گئے ہوں۔ جیسے وہ اس بات کو آگے نہ بڑھانا چاہتی ہو۔ اور یہ خاموشی طول پکڑتی گئی......ہم برج سے گزر رہے تھے، اس نے کھڑکی کا شیشہ نیچے کیا اور سمندر کو دیکھنے لگی۔

میری نگاہ سامنے سڑک پر تھی جس پر سراب بن رہے تھے۔

''سامنے سراب دیکھ رہی ہیں آپ؟ یہ رشتے بھی اس سراب کی مانند ہیں۔ جیسے جیسے قریب جائیں، یہ مدھم سے مدھم تر ہوتے ہوتے ختم ہو جاتے ہیں۔ پاس آنے پر ان کا وجود بھلے نہ ہو......لیکن کچھ تو ہے جس کی وجہ سے ہم انھیں دیکھ سکتے ہیں۔''

میں نے بات مکمل کر کے مڑ کر دیکھا تو وہ پُل کے موٹے اور آہنی رسوں کے اس پار سمندر میں غرق ہو چُکی تھی۔

میں نہیں جانتا تھا کہ جب میں اگلی صبح اس کے گھر پہنچوں گا تو وہ میری طرف بڑھ کر کچھ جھک کر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہے گی؛

''سنو......آج مجھے کہیں نہیں جانا۔''اس سے پہلے کہ میں کچھ بولوں وہ کہے گی کہ ''کل میں نے تمہاری آنکھوں میں ایک روشنی دیکھی ہے......وہ روشنی جو کسی بھی رشتے سے پہلے آنکھوں میں بھر آتی ہے...... یہ اندھی روشنی رشتہ ہی ہے اوراس کے پیچھے کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی ضرورت بھی ضرور ہوگی...... جسے شاید تم نہ دیکھ سکو لیکن میں دیکھ رہی ہوں...... مجھے ضرورتیں نہیں چاہییں ......تھینکس......''اور میں کچھ نہ بول پاؤں گا......صرف اس کے چہرے کو دیکھتا رہوں گا۔

یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ پھر ٹیکسی سے الگ ہوکر اپنے موبائل سے نمبر ملائے گی اور کان کے ساتھ لگا کر کچھ دیر کے بعد کہے گی؛

"Hello. I need taxi."

ادھوری

اتوار کی ٹھنڈی اور مہکتی صبح تھی۔

صحن کی طرف کھلنے والی کھڑکی میں نسب شیشے کے سامنے ایک بلبل مسلسل اپنے پھیکے عکس سے لڑ رہی تھی۔ چونچ اور شیشے کے ٹکراؤ سے پیدا ہونے والی آواز کے سبب جویریا کی آنکھ کھلی تو اس نے موبائل پر وقت دیکھا۔ ابھی تو صرف سات پینتالیس بجے تھے، اس کی پیشانی پر بل آئے کیونکہ رات کئی بار اس کی نیند ٹوٹی تھی، بلبل اور شیشے کی لڑائی کی وجہ سے نہیں بلکہ اس بے چینی کے باعث جو پچھلے کئی ماہ سے کسی چور کی طرح نیند کو چُرا کر وہیں کہیں گھر کے کونے کھدرے میں چھپ رہتی تھی۔

وہ جاگنے کے بعد کچھ لمحوں کے لیے بے سدھ پڑی رہی اور پھر بستر سے نکل کر ایک گہری سی انگڑائی لے کر باتھ روم میں چلی گئی۔ آئینے کے سامنے پہنچی تو اپنے چہرے کو دائیں بائیں گھما کر دیکھا۔ گو کہ جوانی کچھ مدھم پڑ چکی تھی لیکن اپنے آپ کو مطمئن کرنے کیلیے حسن تو اب بھی باقی تھا ہاں مگر آنکھوں کے نیچے جو معمولی سی جھریاں اور رتجگوں کی وجہ سے کالے حلقے تھے، کچھ دنوں سے اس کی پریشانی کا باعث بنے ہوئے تھے۔

چاہنے والوں کی فہرست میں کمی آتی جا رہی تھی۔ ان میں سے اکثر کا کہنا تھا کہ جویریہ ایک خود پرست، منہ پھٹ، خودغرض ہونے کے ساتھ ساتھ مرد بیزار بھی ہے۔ اس کی شخصیت کے متعلق یہ قیاس آرائیاں اس لیے بھی مضبوط لگتی تھیں کہ وہ دو مرتبہ محبت اور ایک شادی کر کے اپنے ماضی کو تلخ تجربات سے گزار کر دیکھ چکی تھی۔ اس کی ایسی طبیعت میں جکڑے تجربات اس قدر بھیانک رہے تھے کہ اسے مردوں سے نفرت سی ہوگئی تھی۔

وہ سب کچھ پانا جانتی تھی جو اسے پسند تھا لیکن پھر بھی ایک خلا تو ضرور تھا، وہ اس خلا کو جان سکتی تو شاید پُر کرنے میں آسانی پیش آ جاتی، مشکل تو یہی تھی کہ بارہا غور کرنے کے باوجود سمجھنے سے قاصر تھی۔ دل بہلانے کے لیے بہت راستے تھے جیسا کہ ہوٹلوں میں گھومنا، بازاروں میں شاپنگ کرنا، نت نئے لباس تن پر سجانا۔ بالوں کے مختلف اسٹائل بنانا......لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا یہ سب بے کار لگنے لگا تھا، کیوں کہ یہ بھی تو ایک یکسانیت تھی اور یکسانیت کا جویریہ کے ساتھ کوئی جوڑ تھا ہی نہیں......اب تو بس دن کی رونق میں کمی سی آ گئی تھی، راتیں خاموش، خالی اور لمبی ہوتی جا رہی تھیں۔

یونیورسٹی کے زمانے کے کئی عشاق اب بھی اسی شہر میں تھے، لیکن اس کے لیے اپنی ایڑیاں رگڑ رگڑ کر تھک چکے تھے، کئی سال سے کسی نے اس سے رابطہ نہ کیا تھا، اس بات پر بھی اس نے غور نہیں کیا کہ سب نے اسے چھوڑا کہ اس نے سب کو چھوڑ دیا......؟

آج اچانک نجانے کیوں اسے اپنا چہرہ دیکھتے ہوئے سب کے خیال نے آ گھیرا تھا۔ وہ ماضی کے پرستاروں کے بارے میں سوچ کر مسکرانے لگی، اس مسکراہٹ کے ساتھ ہی ایک خیال اس کے جی میں پھوٹا کہ کیوں نہ آج کسی پرانے عاشق سے ملا جائے......ان کی آنکھوں سے چھلکتی مستی، باتوں میں بہتی طمع کو پھر سے محسوس کیا جائے، اپنے حسن کو ایک مرتبہ پھر سے تعریف کی قیمت پر پرکھا جائے......وہ کچھ دیر سوچتی رہی اور پھر واپس آ کر بیڈ پر بیٹھ گئی، ریموٹ اٹھا کر ٹی وی چلایا تو اس پر وائلن بج رہا تھا......اس کے ذہن میں اس وائلنسٹ کا خیال پیدا ہوا......وہی جو اپنا درد سُروں میں بھر کر اس کا دل جیتنے کی ناکام کوشش کرتا رہا تھا......''حارث''...... اس نے مسکراتے ہوئے اپنا فون اٹھا کر ایک دو لوگوں سے رابطہ کر کے حارث کا نمبر لے لیا اور پھر وہ دونوں رابطے میں تھے۔

''ہیلو......''

''ہیلو......جی کون......؟''

''کیا اب ہمیں یہ بھی بتانا پڑے گا...... جے۔کے بول رہی ہوں...... جویریا کنول......''

''اوہ......اچھا......کیسی ہو جے۔کے؟''

''ٹھیک ہوں......تم سناؤ......کیا ہو رہا ہے......''

''کچھ نہیں...... یونہی بے کار......''

''ابھی تک......؟''جویریا نے یہ کہہ کر ایک قہقہہ لگایا...... اور پھر بولی۔''کہاں رہ رہے ہو۔''

''وہیں ہوں......اپنے گھر......''حارث کی خشک سی آواز آئی......

''چلو پھر آتی ہوں......''جویریا نے یہ کہہ کر فون کاٹا اور تیار ہو کر گھر سے نکل پڑی۔

راستے میں اس نے ان تمام باتوں کے جواب سوچ لیے تھے جو حارث کی طبیعت میں ابلنے کا امکان رکھتے تھے، وہ جانتی تھی کہ حارث دروازہ کھولتے ہی اس کے چہرے کو خاموشی کے ساتھ کچھ دیر دیکھتا رہے گا اور پھر وہ کہے گی......''ہیلو مسٹر......اندر آ سکتی ہوں یا یہاں سے ہی واپس چلی جاؤں......؟'' وہ چونکے گا اور پھر سر جھٹک کر مسکراتے ہوئے کہے گا،''آؤ......آؤ......" کچھ گھبرا سا جائے گا۔کتنا گہرا عاشق تھا...... بالکل فلمی مگر سچا تھا اور کھرا بھی......''

اسے یاد آنے لگا کہ آخری مرتبہ حارث کو سات سال پہلے ایک دوست کی شادی پر دیکھا تھا۔حارث کی نظروں میں گلہ ضرور تھا لیکن محبت ویسے ہی تازہ تھی، ہونٹوں پر لاکھ روکنے کے باوجود ایک مسکان پھوٹتی تھی...... کچھ ناراض ناراض سا تھا......لیکن میں نے بھی کب منہ لگایا تھا...... میں نے بھی تو ہیلو ہائے کرنے کے بعد خود کو دوسروں کے ساتھ مصروف رکھا تھا۔اسے اگنور کرنے میں کتنا مزہ تھا، اس کی آنکھوں میں کتنی بے چینی سی بھر آئی تھی......اب تو اس کے پاس بہت ساری باتیں ہوں گی، بہت ساری دھنیں......وائلن میں ماسٹر ہو گیا ہوگا۔

دروازے پر دستک ہوئی حارث نے دروازہ کھولا؛

''ہیلو......''

''ہائے......'' حارث کے چہرے پر مسکان تھی تو سہی، مگر پھیکی۔اس نے دروازہ کچھ اور کھول کر جویریا کو راستہ دیا اور پھر بولا''آؤ جے کے۔''

کچھ پل کے لیے جویریا کا دماغ کسی قسم کے خیال سے بالکل خالی ہو گیا۔اس کے قدموں میں جو جوش تھا اس میں کمی آ گئی۔''اتنی پھیکی مسکراہٹ؟ اتنی خالی نظریں؟''اس نے صوفے پر بیٹھتے ہی سوچا۔

''اور کیسی ہو؟''

حارث کی آواز پر جویریا نے مڑ کر دیکھا، وہ فریج میں سے کچھ تلاش کر رہا تھا۔ ''ہاں ٹھیک ہوں۔''

پھر وہ ایک گلاس میں اورنج جوس لے کر آیا اور جویریا کے سامنے رکھ کر سامنے والے صوفے پر نیم دراز ہو گیا۔

''تم سناؤ......'' جویریا جوس کا گھونٹ بھر کر بولی

''کیا سناؤں؟''

''کچھ بھی سنا دو......تمہارے پاس باتیں کچھ کم ہیں؟ وہی سنا دو جو اکثر سناتے تھے...... پیار......محبت......عشق......''

وہ جویریا کی بات سن کر مسکرایا......''وہ سب فضول سی باتیں......''

''اور تمہارا وائلن ......اب تو اورا یکسپرٹ ہو گئے ہو گے......کیوں؟''

''ہاں......وہ......سیکھنے کی بہت کوشش کی مگر سیکھ نہ پایا......اب بھی کبھار ایسا کرتا ہوں کہ پل دو پل کے لیے کیس سے نکال کر اس کی گرد جھاڑتا ہوں اور بو کو تاروں پر پھیر کر بے تکی، بے سُری سی آوازیں سن کر ہی خوش ہو جاتا ہوں، پھر اس کے بعد اسے کئی مہینوں کے لیے واپس رکھ دیتا ہوں۔

خیر......چھوڑو! تمہیں بہت عرصے کے بعد آج دیکھا، سناؤ کیسی ہو....؟'' جویریا کو حارث کی آنکھوں میں بات کے کئی معنی دکھائی دیے۔

''ہاں میں جانتی ہوں، وائلن تمہیں بہت پسند تھا۔''

وہ مسکرائی ''یاد ہے تم نے ایک مرتبہ سگریٹ سے اپنی کلائی جلائی تھی......میں نے پوچھا کہ یہ کیسا پاگل پن ہے؟ تو تم کتنے فلمی انداز میں بولے تھے...... پاگل پن نہیں جنون...... جنون...... جہاں حسن ہو گا وہاں عشق ہو گا اور جہاں عشق ہو گا وہاں جنون بھی ہو گا......''

یہ کہنے کے بعد جویریا نے قہقہہ لگایا۔ حارث کے چہرے پر بھی مدھم سی مسکان نمودار ہوئی جو جویریا کے بڑے قہقہے کو نگل گئی۔

''اور......شادی کا بتاؤ......''

''شادی......؟'' حارث کی بھوئیں دوسوالیہ نشان بن گئیں۔

''ہاں......شادی کی کہ نہیں۔''

''ارے نہیں......کیا رکھا ہے شادی میں...... جب کوئی کام والی ماسی نہیں ملے گی تو شادی کرلوں گا۔''

جویریا ہنسی اور کچھ دیر کے لیے خاموشی سے حارث کا چہرہ تکنے لگی۔''کیا یہ اُس کی وہی آنکھیں ہیں جو میرے چہرے سے ہٹتی نہ تھیں؟ آج اتنی بے نیاز کس لیے ہیں؟ اتنی بے پروائی؟ کیا میں اس سے بھیک مانگنے آئی ہوں......؟'' جویریا گہری سوچ میں ڈوبی حارث کو دیکھ رہی تھی جو مسلسل موبائل کے ساتھ مصروف تھا۔

کمرے میں کچھ دیر کے لیے بالکل خاموشی رہی...... گہری خاموشی جو دھیرے دھیرے جویریا کی سانسوں کے ساتھ اس کے اندر اتر رہی تھی۔

''مسٹر میں دیواروں سے باتیں کرنے نہیں آئی......''

''ہوں......؟'' حارث کی نظریں موبائل پر رہیں، ہونٹوں پر مسکان آئی؛''اچھا، وہ تمہارا عاشق ملا تھا کچھ روز پہلے۔''

''کونسا عاشق؟''

''وہی......شاعر......آصف کمال''

جویریا کچھ دیر چپ رہی'' میرا ذکر تو تم دونوں نے مل کر کیا ہوگا......''

''نہیں۔ میں جلدی میں تھا......اور ویسے بھی اب کیا ذکر کرنا، وہ تو جوانی کی بیوقوفی تھی۔'' حارث نے مسکراتے ہوئے سر جھٹکا۔

دوسانس خاموشی مزید اندر اتری......اور وہ بولی'' کیا مجھے اس کا نمبر مل سکتا ہے؟''

''ہاں نوٹ کرو۔''

جویریا نے پرس میں سے موبائل نکالا اور آصف کا نمبر نوٹ کیا۔

پھر وہی سانس سانس خاموشی...... یہ جو بے وزن باتوں کے درمیان خاموشی کا سلسلہ تھا جویریا کو نجانے کیوں جھ رہا تھا، اس نے دیواروں پر لگی پینٹنگز، کھڑکی سے نظر آنے والے صحن کے پودوں، کمرے میں بکھری ہوئی چیزوں، حارث کے چہرے......ان سب پر سے اس خاموشی

کی پرتیں ہٹاہٹا کر باتیں تلاش کرنے کی ناکام کوشش کی، آخر اکتا کر اٹھتے ہوئے بولی۔ ''مجھے چلنا چاہیے......''

''ابھی تو آئی ہو......'' حارث بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

''ہاں......چلوں بس......''

''اچھا......ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی''

وہ حارث کے گھر سے باہر نکلی تو گاڑی میں بیٹھتے ہی اس نے سر کو جھٹکا...... ''آخر کیوں آ گئی اس کی طرف......؟ کیا ضرورت تھی ملنے کی، کیا سمجھتا ہوگا؟ کہ میرے پاس ملنے کو شہر میں کوئی اور نہیں تھا؟ اس کی آنکھیں کتنی خالی تھیں......اس کے چہرے پر وہ خوشی نہیں تھی......اس نے کوئی گلہ نہیں کیا......اس نے کچھ بھی تو ایسا نہیں کہا جو اکثر کہا کرتا تھا......

ڈرائیونگ سیٹ کے ساتھ سر کو ٹکاتے ہی اسے دفعتاً آصف کا خیال آیا...... ''اس سے اچھا تو وہی تھا۔ نظمیں لکھ لاتا تھا...... مجھ پر نظمیں، میری آنکھوں پر، میرے چہرے پر، اپنے عشق پر......اس کی محبت میں سچائی تھی۔ آج بھی ملے تو دیوانہ ہو جائے۔''

''ہیلو آصف میں جے۔ کے بول رہی ہوں۔''

دوسری طرف کچھ خاموشی رہی اور پھر آواز آئی ''اچھا اچھا...... جے۔ کے کیا حال ہیں؟''

''شکر ہے پہچانا۔ ٹھیک ہوں تم سناؤ شاعر......''

''ٹھیک ہوں میں بھی......آج کیسے اچانک؟''

''کچھ نہیں آوارہ گردی پر نکلی ہوں سوچا تم سے بھی بات ہو جائے۔''

''ہوں............اوکے......آجاؤ پھر۔''

کچھ ہی دیر میں وہ آصف کے پاس تھی۔

ادھر آصف کا چہرہ بھی بہت بدلا ہوا محسوس ہوا، بہت سنجیدہ سا۔ جویریا کو اس سے بات کرنے میں مشکل محسوس ہو رہی تھی، شاید یہ اس لیے تھا کہ کچھ دیر پہلے کڑوے تجربے کے سبب اس کے مزاج کا ذائقہ بدمزا ہو چُکا تھا۔

''اب بھی لکھتے لکھاتے ہو شاعر......؟'' اس نے اپنی انگلی میں انگوٹھی کو گھماتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں نہیں......اب تو نہیں......وہ تو بس ایسے ہی......''

''ایسے ہی......؟ پہلے تو بہت شاعری کرتے تھے۔''

''ہاں بے وزن اور بے کار شعر تھے۔تم ہی تو کہتی تھیں۔''

''ہاں تھے تو بے کار ہی......تمہاری آنکھیں جھیل ہیں......ہونٹ پھول کی پتیاں......''

جویریا نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

وہ بھی مسکرایا۔''ہوں......کچھ ایسا ہی تھا......''

جویریا اس کی آنکھوں میں کچھ تلاش کر رہی تھی۔''اب نہیں ہے......؟''

''نہیں......اس عمر میں سبھی شاعری کرتے ہیں۔''

''پر تم نے چھوڑی کیوں۔''

''ارے ایسے ہی بس......شاعری میں کچھ جان ہوتی تو تم میری جان ہوتی۔'' یہ کہہ کر آصف نے قہقہہ لگایا۔

''اچھا ہے......یہ بھی ٹھیک تھا......''

''یہ ٹھیک تھا؟ تمہارا ٹیسٹ تو اور بھی گر گیا جے۔کے......'' آصف کے لہجے میں بھرے طنز کو بخوبی محسوس کیا جا سکتا تھا......

جویریا کے چہرے کے پیچھے چھپی سنجیدگی واضح ہو گئی۔

''کیا کر رہی ہو آج کل......میاں کیا کرتے ہیں؟''

''میاں......'' ایک گہری آہ بھرنے کے بعد وہ بولی ''مجھ سے شادی کر کے کسی اور کے ساتھ عشق لڑاتے تھے، جب میں ان کے پاس تھی، اب پتہ نہیں کیا کرتے ہیں...... باسٹرڈ......'' ماتھے پر کئی بل بنے۔

''کیا؟ تم سیپریٹڈ ہو؟''

''ہاں......بہت سال ہو گئے......''

''کہیں اور شادی کر لی ہوتی۔''

''نہیں......Infact dont want suc as holes in my life any more یہ محبتیں......شادیاں......سب جنجال ہے......کنٹریکٹ ہیں جو مجھ سے نہیں ہوتے''

''ہوں......''

''چھوڑو اسے تم بتاؤ......کیا کر رہے ہو۔''

''بس کچھ نہیں، بزنس......اور بیوی بچے''

''اوہ تو شادی کر لی......''

''ہاں......کر ہی لی۔''

''ارینج ہو گی۔''

''نہیں نہیں......لو تھی......سب ٹھیک ہے......ہیپی لائف......دو بچے ہیں۔آج اپنے نھیال گئے ہیں۔''

'' اچھا ہے......''

اس کمرے میں بھی جویریا کو وہی وحشت ناک خاموشی اترتی ہوئی محسوس ہوئی تو وہ فوراً بولی۔

''پرانی نظمیں ہی سنا دو شاعر......''

''کہاں رہی ہیں......سب کہیں گُم ہو گئیں......اب تو بس زندگی میں پھنسے ہوئے ہیں......''

جویریا کو اس بے پروائی پر کچھ عجیب محسوس ہوا، جو اس بار بھی اس کے اندر کو دہکا سا رہا تھا۔اسے دوسری مرتبہ بالکل ویسی مایوسی کا سامنا کرنا پڑا تھا،اس کی انا کے پرخچے بُری طرح سے اڑ رہے تھے،اس کے اندر کچھ ایسا تھا جس کی طلب ختم ہونے کی بجائے مزید بڑھنے لگی تھی۔ماحول پر جب بھی یہ خوف ناک خاموشی چھاتی تو اسے اپنی لپیٹ میں لے لیتی، وہ اس سے بچنے کی خاطر کوئی بات بھی کرتی تو وہ بھی بہت خشک سی ہو کر رہ جاتی۔''میں یہاں کس لیے ہوں؟''اس نے خود سے سوال کیا اور پرس اٹھا کر باہر کی جانب چلنے لگی۔چلتے چلتے اس کے کانوں میں آواز آئی ''ارے...... جے کے کہاں چلیں؟ رکو تو سہی......ہوا کیا؟''اس نے کوئی جواب نہ دیا اور گاڑی میں بیٹھتے ہی گاڑی سٹارٹ کی، وہاں سے دور نکل آئی۔

دراصل وہ خود بھی سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ یہ غصہ کیسا تھا؟ بوجھ کیسا تھا؟اس کا دل کیوں چاہ رہا تھا کہ وہ کسی ویران جگہ پر جا کر چیخے اور اتنا چیخے کہ اس کے اندر بھری خاموشی ڈر کر کہیں دور بھاگ جائے۔کچھ بھی تھا لیکن ان سب کے بیچ میں ایک خواہش تو بہر حال پوشیدہ تھی، جو اس کے

حسن کی تکمیل کے لیے ضروری تھی۔ ان دونوں میں سے کوئی ایک بھی اسے نظر بھر کر دیکھ لیتا تو شاید اسے کچھ سکون میسر آ جاتا۔ وہ ان کی اس قدر بے پروائی سے جھنجھلا گئی تھی۔

دل پر چانے کے لیے اور کون سا ٹھکانہ بہتر تھا؟ اس نے سوچا......اور گاڑی سینما کی طرف دوڑائی، ٹکٹ خرید کر وہ آرام دہ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ بار بار خیالات کو جھٹک کر وہ سکرین کی طرف متوجہ ہوتی لیکن پھر گزشتہ گھنٹوں کی ساری فلم اس کے سامنے آ جاتی۔ وہ کیوں جھکی تھی؟ وہ کیوں ان کے پاس گئی تھی؟ اسے ضرورت ہی کیا تھی......؟

''ضرورت؟ نہیں نہیں......کیسی ضرورت؟ وہ برباد لوگ ہیں۔ تباہ لوگ......کل بھی بے کار تھے آج بھی ویسے کے ویسے ہیں، بالکل بھی نہیں بدلے......لیکن پھر میں کس امید کے سہارے ان کے آس پاس منڈلا رہی تھی؟ کوئی امید نہیں...... میں تو وقت گزاری کرنے کے لیے......لیکن......میں بھی تو بے کار ہی ہوں......نہیں نہیں......''

اس کے اندر تلاطم اپنے عروج پر تھا۔ اڑھائی گھنٹے کی فلم کب شروع ہوئی اور کب اس کی آنکھوں کے سامنے ختم ہو گئی کچھ پتہ نہ چلا......فلم بین اٹھ کر جانے لگے وہ بیٹھی انھیں تکتی رہی اور سب سے آخر میں بہت آہستہ قدموں کے ساتھ چلتی ہوئی باہر نکل آئی۔

کچھ وقت گاڑی میں بیٹھے رہنے کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ گھر ہی جایا جائے......

لیکن گھر بھی کیا تھا؟ وہاں بھی تو کچھ نہیں تھا......یہی خالی پن، یہی اداسی......یہی وحشت......کسی کے پاس جانا بھی بے کار تھا......اس کے اندر جو صبح تازگی بھری ہوئی تھی اب روکھے پن میں بدل گئی تھی، اس کا چہرہ جذبات سے خالی ہو چکا تھا اور آنکھیں باسی تھیں، گو کہ دھوپ ٹھنڈی پڑ چکی تھی لیکن جویریا کے وجود کو تلخی کے ساتھ کاٹ رہی تھی، اس نے نظر اٹھا کر سورج کی طرف دیکھا تو اس طرف سوائے ایک اندھی روشنی کے اور کچھ نہ تھا، اپنے آپ کو عاجز پایا تو اس کا جی چاہا کہ وہ سورج کو پکڑ کے نیچے اتار لائے اور پاؤں سے مسلنے کے بعد زمین میں دفن کر دے۔ لیکن آج ایسا کچھ بھی تو ممکن نہ تھا جو اس کی خواہش کے مطابق ہو......فطرت اس کے وجود میں سے چھید کر کر کے اپنا ہونا منوانے پر تلی ہوئی تھی۔ اس نے لاشعوری طور پر گاڑی کو سٹارٹ کیا اور گلوریا جینز کیفے کی طرف چل نکلی۔

وہاں پہنچ کر اس نے اطمینان سے کافی کا کپ پیا اور ادھر ادھر بیٹھے لوگوں کو تکنے لگی۔

بالکل سامنے والی ٹیبل پر ایک نوجوان بیٹھا لڑکی کے ساتھ مسکرا کر گپیں لگا رہا تھا، خوبصورت تھا، آنکھوں میں چمک تھی۔ جویریا اس کی آنکھوں کی چمک مستعار لے کر تاریک بدن میں روشنی بھرنے کی کوشش کرنے لگی۔لڑکے کی نظر بھی تھرکی اور جویریا سے ٹکرا گئی لیکن فوراً ہی وہ سامنے بیٹھی لڑکی کے ساتھ محوِ گفتگو ہو گیا...... جویریا کی نظر مسلسل اس پر تھی۔لڑکے نے دوبارہ دیکھا......اس مرتبہ اس کی نگاہیں کچھ زیادہ وقت کے لیے جویریا پر ٹھہریں، اسی دوران میں جویریا نے اپنے ہاتھ سے ٹشو کو میز سے نیچے گرا دیا اور پھر بہت آرام سے اٹھانے کے لیے زمین کی طرف جھکی...... وہ جانتی تھی کہ اس کی ٹاپ کا گلہ بہت کھلا ہے اور نوجوان کسی صورت اپنی نظر نہیں ہٹا پائے گا۔لیکن نوجوان نے جویریا کو دیکھا اور پھر مسکرا کر سامنے بیٹھی لڑکی سے گفتگو میں جڑ گیا...... جویریا سیدھی ہو کر بیٹھی اور کمر کو کچھ اکڑا لیا جس سے اس کا سینہ کچھ اور باہر کو نکل آیا تھا...... بے کار کوشش تھی...... نوجوان نے دوبارہ اس کی طرف نہ دیکھا۔

جویریا نے ادھر ادھر نظر گھمائی، سٹاف میں آج وہ لمبے بالوں والا لڑکا بھی تو کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

ہاں وہی جو اس کے ساتھ بہت مسکرا مسکرا کر باتیں کیا کرتا تھا، اس لڑکے کی مسکراہٹ قابلِ دید ہوا کرتی تھی......لیکن وہ تھا کہاں؟

کچھ دیر وہ کافی کے خالی کپ کو گھماتی رہی پھر اٹھ کر کاؤنٹر پر چلی گئی۔

''ایکسکیوزمی...... یہاں ایک لڑکا ہوتا ہے، لمبے بالوں والا......''

کاؤنٹر پر کھڑی لڑکی نے مسکرا کر جواب دیا،''جی میڈم......شاید آپ فیصل کی بات کر رہی ہیں۔وہ چھوڑ گیا ہے۔کوئی کام ہے تو بتائیں۔ہاؤ مے آئی ہیلپ یو؟''

''نہیں کچھ نہیں...... تھینکس۔'' اتنا کہہ کر وہ وہاں سے باہر نکل آئی۔

روشنی بجھنے لگی تھی۔شام پورے ہنگامے کے ساتھ شہر میں اتر آئی تھی۔گاڑیوں کا شور بڑھ چکا تھا۔لوگوں کی طرح طرح کی آوازیں گردونواح میں سنائی دینے لگی تھیں۔بکھرے بکھرے خیالات چھوٹے کیڑوں کی طرح رینگ رہے تھے، گاڑی اس کے جسم کو لیے گھر کی جانب بڑھ رہی تھی، ذہن روبوٹ کی طرح لال، پیلی ہری بتیوں کو پڑھ رہا تھا......مگر اس دوران وہ خود کہیں بھی موجود نہ تھی......اس کے اندر ایک گہری خاموشی تھی۔ایک سناٹا تھا۔ایک خالی پن تھا......ایک

ادھورا پن تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اپنے عشاق سے ملنے پران کے کمروں میں بار بار اترنے والی خاموشی جواس کے وجود میں اترتی رہی تھی، اندر ہی اندر پھیل کر اتنی جگہ گھیر لے گی کہ سانس تک لینا دشوار ہو جائے گا۔

گھر آ چکا تھا......گاڑی رک چکی تھی......اور وہ سامنے لگے گیٹ کی سلاخوں کے اس پار اداسی اور سناٹے کے رقص کو دیکھ سکتی تھی...... بہت وقت وہاں بے سبب رکنے کے بعد بیابانی سے بھرے وجود کو جب اپنے بیڈ روم میں دھکیلا تو یہاں بھی ہر ایک شے خاموش تھی......دیواروں پر لگی اس کی سب تصویریں جیسے دھندلی سی پڑ گئی ہوں......اندر کی خاموشی اور کمرے میں پھیلی نیم تاریکی میں کتنی مماثلت تھی......سر گھما کر موجود ہر ایک چیز کو دیکھنے کے بعد ایک طرف پڑے ڈریسنگ ٹیبل کی جانب بڑھی اور اس میں نصب آئینے کے سامنے رک گئی۔

چہرہ...... رنگ...... آنکھیں...... ہونٹ...... بال...... سب کچھ ویسے کا ویسا ہی تو تھا......فرق ہوگا بھی تو اتنا زیادہ نہیں کہ لوگوں کی دلچسپی حاصل کرنے کے لیے ناکافی ہو۔اس کے سارے ابھار تھوڑے بڑھ گئے تھے، لیکن اتنے بھدے تو بالکل بھی معلوم نہ ہو رہے تھے......پھر کچھ تو کم تھا۔ کہیں تو کوئی کمی رہ گئی تھی......اس کے ذہن میں گلوریا جینز میں بیٹھے اس لڑکے کا خیال ابھرا جس نے جویریا کے سینے کو بالکل بھی توجہ سے نہ دیکھا تھا......''لیکن کیوں؟ وہی سینہ تو تھا جس کو مرد کی نظر ڈوپٹے کے نیچے سے بھی بھانپ لیتی ہے......''

عجیب بات ہے......مرد عورت کے بغیر مکمل کیوں نہیں ہے، عورت مرد کے بغیر ادھوری کیوں ہے؟ یہ فطرت عجیب ہے، یہ نظام عجیب ہے اس نظام کی ڈس آرڈرنگ، بدنظمی، توڑ پھوڑ سے انسان اس قدر متاثر کیوں ہو جاتا ہے؟ وہ خیالات کے بھنور میں پھنستی چلی جا رہی تھی۔

کیا تھا یہ......؟ کیوں تھا......؟ فطرت اتنی بدمزاج، بے پرواہ، زورآور کیسے ہو سکتی تھی......؟

اس نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر گہری نظر سے اپنے پورے جسم کا بغور جائزہ لیا، اس کے باوجود کہیں بھی کوئی بھی گوشہ ایسا نہ ڈھونڈھ پائی جو کبھی مردوں کی توجہ کی وجہ ہوا کرتا تھا...... آخر جھنجھلا کر ٹاپ اتاری اور ایک طرف پھینک دی، پھر تھکے ہوئے جسم کے ساتھ بستر میں گھستے ہی ساتھ پڑے تکیے کو بانہوں میں لے کر اک خلا سا پُر کیا اور آنکھیں موند لیں۔

تصورات کے اندھیروں میں کہیں کوئی بلبل اپنے ہی پھیکے عکس کے ساتھ لڑ رہی تھی......اور ابھی تو بہت رات باقی تھی۔

خاموش۔

خالی۔

اور لمبی رات۔

سَلونی

گلی کے آوارہ کتوں نے میاں صاحب کے دروازے پر بھونک بھونک کر تاروں بھرا آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔

میاں صاحب کی بہت ہی لاڈلی کتیا ''سلونی'' بھی کہاں خاموش تھی، باہر سے ایک بار بھونکنے کی آواز آتی تو وہ دس مرتبہ اس کا جواب دیتی۔ وہ آزادی چاہتی تھی، وہ چاہتی تھی کہ زنجیر کھلے اور وہ اچھلتی کودتی باہر نکل جائے، پھر گلی کے آوارہ چاؤں چاؤں کرتے کُتے اس کے آگے پیچھے پھریں۔ وہ ان کے ساتھ گلیوں میں گھومے، اسی طرح بہت سارا وقت گزارنے کے بعد گھر لوٹ آئے، گھر میں بھی میاں صاحب پیار سے ''سلونی سلونی'' کہہ کر پکاریں، ان کی بہن بواجی تھالی میں بسکٹ رکھے، میاں صاحب کی بیٹی سارہ اس کے قریب آکر بیٹھے اور اپنے مرمریں ہاتھوں سے اس کے سر کے سفید ریشمی بال سہلائے۔ ہاں لیکن......میاں صاحب کی بیوی سے سلونی کو بالکل بھی پیار کی توقع نہیں تھی کیوں کہ وہ آتے جاتے سلونی کو گھر سے نکالنے کی ہی بات کرتی تھیں۔

دراصل سلونی کو گھر سے باہر نکلنے کی لت سی پڑ گئی تھی جس کے نتیجے میں وہ دوبار ''ماں'' بن چکی تھی، سلونی کا یوں ماں بننا میاں صاحب کو بھی سخت ناگوار گزرا تھا۔ اسی لیے انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ سلونی کو بچوں سمیت دوست کے ہاں بھیج دیں گے۔ کیوں کہ سلونی بقول میاں صاحب ''آوارہ'' ہو چکی تھی۔ دونوں مرتبہ بچے تو تقسیم کر دیے مگر اپنی لاڈلی سلونی کو کسی کے ہاتھوں میں دینے کے لئے اتنا بڑا دل کہاں سے لاتے؟ سو گھر میں سخت ہدایات جاری کر دی گئیں کہ سلونی کی زنجیر نہ کھولی جائے اور باہر کے دروازے پر کنڈی چڑھا کر رکھی جائے۔ ان ہدایات پر سختی سے عمل

درآمد ہونے لگا۔سلونی باہر جاتی نہ آوارہ کتے اندر آتے ......نتیجتاً سلونی بھونک بھونک کر پاگل ہوتی جارہی تھی۔اس نے اپنے پنجوں سے زمین کھود کر ایک گڑھا سا بنا دیا تھا۔جب تھک جاتی یا میاں صاحب کی بیوی کی گالیاں سُنتی تو ''چوؤں چوؤں'' کر کے پیروں پر سر رکھ لیتی اور بالوں میں چھپی آنکھوں سے گھر والوں کو تکنے لگتی۔

سلونی کی اس ''چوؤں چوؤں'' کا انداز سب گھر والوں کے لئے الگ الگ تھا، جیسے کہ میاں صاحب کی بیوی کو گالیوں کا جواب اپنی زبان میں دے رہی ہو،میاں صاحب کو کوس رہی ہو یا پھر بوا جی اور سارہ سے آزادی کی التجا کر رہی ہو۔

سلونی کی آواز سُنی تو میاں صاحب کی بیوی صحن میں آ کر چلائیں ''کیوں بھونکے جا رہی ہے؟ کمینی کہیں کی......سو بار کہا کسی کو دے آئیں پلید اور نجس چیزوں سے گھر بھر رکھا ہے۔نہ دن کو چین نہ رات کو......''

یہ کہنے کے بعد جب وہ چلی گئیں تو بوا جی نے کچھ بسکٹ تھالی میں رکھے،سلونی نے بوا جی کو دیکھتے ہی مخصوص انداز میں چوؤں چوؤں کیا اور اگلے پاؤں اٹھا کر آزادی کی بھیک مانگنے لگی۔سلونی کا انداز قابلِ رحم تھا لیکن بوا جی بھی کیا کرتیں؟ بے بس تھیں ، بھائی کا ڈر نہ ہوتا تو نجانے کب کا سلونی کو آزاد کر چکی ہوتیں (چاہے کچھ دیر کے لئے ہی سہی)۔

بسکٹ تھالی میں رکھ کر بوا جی کمرے میں آ گئیں جہاں سارہ پہلے سے موجود تھی۔

''ہر وقت بھونکتی رہتی ہے جیسے پگلا گئی ہو۔بھائی جان بھی تو ایک پل کے لئے نہیں کھولتے اسے''بوا جی صوفے پر بیٹھ گئیں۔

سارہ قریب آئی اور بوا جی کے قدموں میں بیٹھ کر اپنا سر ان کی گود میں رکھ دیا۔

''کیا بات ہے؟ کیوں بجھی بجھی سی ہے؟''بوا جی نے سارہ کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے بہت شفیق انداز میں پوچھا۔

''کچھ نہیں''

''کچھ تو ہے......بول امی نے ڈانٹا ہے؟''

''نہیں......''

''پھر؟''

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد سارہ بولیں ''بوا جی......ایک بات پوچھوں؟''

''ہاں پوچھ'' بوا جی ابھی تک سارہ کے بالوں کو سہلا رہی تھیں۔

''بوا جی......وہ......مجھے پوچھنا یہ تھا کہ......پہلے آپ بتائیں غصّہ تو نہیں کریں گی نا؟''

''پاگل تیری بات کا پہلے کبھی غصّہ کیا جواب کروں گی؟ بول کیا بات ہے؟''

''بوا جی......آپ نے کبھی......آپ نے کبھی کسی سے محبت کی ہے؟'' سارہ نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

بوا جی کا ہاتھ سارہ کے بالوں پر رک گیا ''محبت؟ محبت......کی تو ہے......اپنے ابّا جان سے بہت محبت تھی مجھے'' بوا جی کی آواز کچھ لرز رہی تھی۔

''نہیں نہیں، وہ والی نہیں...... جب آپ جوان تھیں تو اپنی عمر کے کسی لڑکے کے ساتھ محبت ہوئی؟''

''بے شرم ہوگئی ہے تو'' بوا جی نے سارہ کا سر اپنی گود سے اٹھایا اور صوفے سے اٹھنے لگیں، سارہ نے بوا جی کا ہاتھ پکڑ لیا ''بتائیں نا......'' بوا جی نے ایک پل کے لئے سارہ کے معصوم چہرے پر نظر دوڑائی اور پھر دوبارہ صوفے پر بیٹھ گئیں۔

''کیا بات ہے؟ کیوں پوچھ رہی ہے ایسی باتیں؟ لگتا ہے بہت رسالے پڑھنے لگی ہے...... یہ سب بکواس کہاں سنتی ہے؟ کالج کی لڑکیوں سے؟''

''بتائیں نا، بوا جی'' سارہ نے ضد جاری رکھی۔

بوا جی نے کمرے کے دروازے کی طرف دیکھا اور پھر سارہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں؛

'' بیٹا ایسی محبت تو ایک ناجائز سا تعلق ہے، لڑکیوں کے لیے......اور شادی سے پہلے تو بالکل بھی جائز نہیں''

''مگر محبت تو ایک جذبہ ہے تو پھر یہ جائز ناجائز کیسے ہوا؟'' سارہ نے بھولے پن کے ساتھ اپنا معصوم سا فلسفہ سامنے رکھا۔

'' بکواس ہے...... کچھ نہیں ایسا، کہانیوں میں ہوتا ہے، فلموں میں ہوتا ہے۔ یہ ایک گندا غلیظ اور گھناؤنا کھیل ہے......اور بس......'' بوا جی کی آواز پہلے کی نسبت کچھ زیادہ بھری ہوئی تھی۔

''مگر کیسے؟ کیوں؟ کس لیے......؟'' سارہ کی جبیں پر بل آئے......ادھر صحن میں سلونی

کے بھونکنے کی آواز بھی گونجی۔

''کیوں کہ بیٹا ہماری زندگیوں کے فیصلے ہمیشہ ہمارے ماں باپ، بھائی اور شوہر طے کرتے ہیں۔ شادی سے پہلے محبت ناجائز تعلق کی طرف پہلا قدم ہی سمجھا جاتا ہے۔ یہ روایت ہے، الجھوگی تو بدنام ہو جاؤ گی، لڑو گی تو بے موت مرو گی......نصیب ہار ہی ہے......تو نہیں جانتی ہمارے ہاں لڑکی کا محبت کرنا جرم ہے، کرنا ہی نہیں ہو جانا بھی جرم ہے'' بوا جی کا لہجہ بہت شکستہ تھا......لفظوں میں کرب تھا۔

''بوا جی......کیا میں اپنی مرضی سے شادی بھی نہیں کر سکتی؟'' سارہ کی آنکھوں میں آنسو ابھر آئے......

''شاید کر سکتی ہو، لیکن محبت نہیں......بالکل بھی نہیں......'' بوا جی نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔

صحن میں میاں صاحب داخل ہوئے تو سلونی بھونکنے لگی، میاں صاحب جو چند قدم چل کر آگے آ چکے تھے سلونی کی آواز سنتے ہی پیچھے مڑے اور باہر کے دروازے پر کنڈی چڑھا دی۔

جب بوا جی نے کھڑکی میں سے انھیں آتے دیکھا تو فوراً اٹھ کھڑی ہوئیں:

''چل وضو کر لے، نماز کا وقت ہو گیا''

سارہ نے بجھے لہجے میں جواب دیا ''نہیں پڑھنی ہے مجھے نماز......آپ جائیں......''

سلونی شام سے بہت زیادہ بھونک رہی تھی۔

جب وجود کو جوانی کی میٹھی دھوپ چھوتی ہے تو فطرت کا بانکپن بھی دیکھنے کے لائق ہوتا ہے۔ چاہنے اور چاہے جانے کا دل کرتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی خواہشات پانی کے بلبلوں کی طرح بنتی اور ٹوٹتی ہیں۔ جہاں قہقہے لگانے کو جی چاہتا ہے، دل ضد کرتا ہے کہ اس کی بھی سنی جائے......وہ بھی کسی سے کچھ کہے۔

جوانی فطرت کی طرف سے ایک انمول تحفہ ہے......لیکن جہاں خوشبو بکھیرتی یہ پھول کی پتی کی طرح نازک ہے، وہاں اتنی سخت بھی کہ ہواؤں کے دباؤ سے چٹخنے میں دیر نہیں لگتی۔ چنچل، شریر، نٹ کھٹ اور شگفتہ ہے تو ادھر مغرور، خوددار، خودسر، منہ زور اور باغی بھی......غضب تو یہ ہے کہ ان تمام خصوصیات کے ساتھ ساتھ یہ کمبخت معصوم بھی ہے۔

کچھ ایسا ہی تھا کہ سلونی اور سارہ کی گھٹن کی وجہ ایک ہی تھی لیکن دونوں کی آرزؤں میں

فرق واضح تھا۔سلونی شعور سے عاری تھی اور اپنی فطرت میں الگ تھی، دوسری طرف سارہ......
باشعور تھی اور اپنے اخلاقیات کے پیمانوں کی قدر کرنا جانتی تھی۔ دونوں میں یہ بھی مماثلت تھی کہ
دونوں کے گلے میں زنجیریں تھیں۔ایک کو آہنی زنجیر نے باندھ رکھا تھا دوسری کو کسی غیر مرئی زنجیر
نے......اور فطرت کو یہی نامنظور تھا۔

سارہ کبھی کبھی سلونی کے قریب بیٹھ کر اس کے سفید ریشمی بالوں کو سہلاتی اور محسوس کرتی
کہ سلونی اور اس کے بیچ میں کچھ تو ہے، لیکن کیا؟ یہ سمجھ سے باہر تھا۔

بوا جی کی آواز سنائی دی؛

''سارہ بیٹا کھانا کھالے، اتنی آوازیں دی ہیں......آ جا میری بچی''

''نہیں کھانا کچھ بھی......بھوک نہیں مجھے''

''بیٹا تھوڑا سا تو......''

''کہانا، نہیں ہے بھوک......'' سارہ کا لہجہ کرخت تھا۔

بوا جی نے چند بسکٹ سلونی کی تھالی میں رکھے سلونی نے اگلے پیر اٹھا کر بوا جی کے
سامنے وہی چوؤں چوؤں کی۔

ساری رات گلی کے آوارہ کتے بھونکتے رہے، سلونی بھی پاگلوں کی طرح برابر بھونکتی رہی،
اپنے پنجوں سے زمین کریدتی رہی اور سارہ کے بستر کے ساتھ لیٹی بوا جی سارہ کی سسکیاں سنتی رہیں۔

صبح میاں صاحب کی بیوی کمرے میں داخل ہوئیں۔

''حرامزادی سلونی نے ساری رات سونے نہیں دیا، کہوتو کہیں چھوڑ کر نہیں آتے منحوس
کو......سارہ اٹھ جا، کالج نہیں جانا؟ کیسے پڑی ہے......اٹھ جا''

''نہیں جانا کہیں بھی......'' سارہ کا جواب آیا

''نہیں جانا؟ کیوں نہیں جانا؟ اٹھ......ہڈیاں توڑ دوں گی''

سارہ اٹھی اور زور سے بولی''توڑ دو ہڈیاں......میں تمہاری پالتو ہوں نا؟ جو دل کرے
گا وہی کرو گے، جب دل کرے گا نکال کے باہر کرو گے......پتہ نہیں کیا سمجھا ہوا ہے......''

میاں صاحب کی بیوی نے دانت بھینچتے ہوئے بوا جی کی طرف دیکھا مگر بات سارہ سے
ہی کی''تو جس کی زبان بول رہی ہے میں سمجھ رہی ہوں، اتنی سی بات پہ اتنا کیوں اکڑ رہی ہے؟ کیا

کہہ دیا تجھے؟''

''کسی کی زبان نہیں بول رہی، آپ اپنے کام سے کام رکھیں، مجھے سلونی مت سمجھیں''

سارہ نے منہ پھٹ بن کر جواب دیا

میاں صاحب کی بیوی آگے بڑھیں اور کڑکتا تھپڑ سارہ کے منہ پر رسید کیا اور کمرے سے باہر بولتے ہوئے نکل گئیں ''کمینی حرامزادی......سلونی......تو ہے ہی سلونی، اس کی زبان بھی اندر نہیں پڑتی تیری بھی......حرامزادی آنے دے اپنے باپ کو، بدزبان......''

ادھر سلونی اور زیادہ بھونکنے لگی......میاں صاحب کی بیوی پھر چلائیں ''ایک اس کا بھونکنا بند نہیں ہوتا، آج تو بس اسے گھر سے نکلوا کر ہی رہوں گی، آجائیں وہ......ایک پل کو سکون نہیں لینے دیتی......'' وہ بولتے بولتے چھت کی سیڑھیاں چڑھنے لگیں۔

بوا جی اور سارہ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، سارہ کے گالوں پر آنسو تھے اور بوا جی کی آنکھوں میں......

سلونی مسلسل بھونکے جا رہی تھی، اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ زنجیر توڑ ڈالے......

بوا جی چپ کے سے اٹھیں اور باہر کا دروازہ کھولا، سر نکال کر گلی کے اطراف میں دیکھا اور پھر سلونی کے قریب جا کر اس کے گلے میں بندھے پٹے میں سے زنجیر نکال دی......

نظر کا دھوکا

''رکو......بھئی بہت ہی عجیب کہانی کار ہو۔تم نے تو میری زبان سے نکلا ایک ایک لفظ جوں کا توں لکھ ڈالا......کیا افسانہ ایسا ہوتا ہے؟

اچھا......چلو دوبارہ پڑھنا شروع کرو اب بیچ میں نہیں بولتی۔ہاں......لیکن لکھتے لکھتے جو ہمارے درمیان باتیں ہوئی ہیں بعد میں انہیں کاٹ دینا......چلو پڑھ کر سناؤ اب۔''

اندھیروں کے باسیوں کے لیے اندھیرا اتنا بڑا عذاب نہیں ہے۔لیکن جب لوگ روشنیوں کی باتیں کرتے ہیں تو دل میں ایک آرزو تو اٹھتی ہے......اور وہ سلگتی ہوئی آرزو کب راکھ ہو جاتی ہے پتہ بھی نہیں چلتا۔ہاں......مگر جو لوگ پہلے روشنیاں دیکھ چکے ہوں ان کے لیے اندھیروں کے لحاف میں کتنی گھٹن ہوتی ہے......اس کا اندازہ تو مجھ سے بہتر کوئی نہیں لگا سکتا......مجھ جیسی کے اندر تو روشنیوں کی آرزو سلگتی رہتی ہے۔یہ کبھی راکھ نہیں بنتی۔

میں اکثر اپنے ماں باپ کے نصیب کے بارے میں سوچ کر اداس ہو جاتی ہوں۔نجانے کیا کیا سوچ کر میرا نام ''روشنی'' رکھ دیا ہوگا......شاید نہیں جانتے تھے کہ میں چند سال ہی اجالوں کو دیکھ سکوں گی......پھر پوری زندگی ترستی رہ جاؤں گی......

خیر......میں تمہیں اپنی کہانی سنانے والی تھی۔ہاں تو سنو......بلکہ لکھو......وہ مجھ سے کب کہاں کیسے ملا......یہ ضروری نہیں ہے۔سو میں ان باتوں کو چھوڑ کر تمہیں وہ بتاتی ہوں جو لکھنے کے قابل ہے۔

اس نے جب پہلی بار میرے ہاتھ کو چھوا تھا تو ایک عجیب سا احساس ملا تھا۔ویسے تو میں عادی ہوں، دن میں کئی بار ان لوگوں کے ہاتھ تھامتی ہوں جو میری مدد کر کے جنت کماتے ہیں۔

لیکن اس کے لمس میں اس دن ایک بہت ہی مزیدار قسم کا احساس تھا۔ جسم میں ایک گرمی سی دوڑی تھی......میری اندھیری دنیا جس کا کوئی سرا نہیں......نا آسمان نا ہی زمین...... جہاں حد نظر اندھیرا ہی اندھیرا ہے......اس دنیا میں مجھے کئی پھلجھڑیاں جلتی دکھائی دی تھیں۔ وہ منظر اتنا خوبصورت تھا کہ مجھے اس دن نابینا ہونا پہلی بار خوبصورت لگا......شاید میری آنکھیں ہوتیں تو میں شرم کی چادر اوڑھ کر سمٹ جاتی کہ مجھے اس پارک میں کتنے لوگ دیکھ رہے ہیں......لیکن کیوں کہ میں نہیں دیکھ سکتی سو میں دنیا سے ایسے بے نیاز تھی کہ جیسے میرے ساتھ ساتھ ساری دنیا نابینا ہے۔

کاش...... دنیا بھی نابینا ہوتی......کون کیا کر رہا ہے......دیکھ ہی نہ سکتی......اور خدا کی قسم پھر ایسے لمحوں کا لطف بھی بے پناہ اٹھاتے......لیکن وہ زندگی کی تمام لذتیں......تمام حسن چھوڑ کر نجانے کیوں دوسروں کی زندگیوں میں جھانکنے لگتے ہیں......کاش......کہ سب نابینا ہوتے...... کاش......ایسے لمحات میں تو ضرور نابینا ہوتے۔

ہاں......تو میں کہہ رہی تھی وہ پہلا لمحہ تھا کہ جب میں اپنے نابینا ہونے کا افسوس بھی بھول چکی تھی جو ہر لمحہ میرے ساتھ رہا کرتا تھا۔

دراصل اس نے مجھے ویسے بھی بلا کی خوداعتمادی دے دی تھی......اس نے مجھے دنیا کی سب سے خوبصورت لڑکی کہا تھا...... مجھے تو صرف اپنے بچپن کی شکل یاد تھی۔ جوان ہو کر میں کیسی تھی میں نے کبھی کسی سے پوچھا تک نہیں تھا......اور کسی نے بھی بتایا نہیں تھا۔ لیکن اس کے الفاظ آئینہ تھے جن میں خود کو دیکھ سکتی تھی......میری آنکھیں......میرے ہونٹ......میری ناک......میرے کان...... میرا بیضوی چہرہ...... میرے بال...... میری گردن...... میری مسکراہٹ...... میری چال......میرے ہاتھ......سب کچھ......سب کچھ اس نے میرے آگے اس طرح بیان کیے تھے کہ میں بھی غرور کرنے لگی تھی......خود کو سچ میں دنیا کی حسین ترین لڑکی سمجھنے لگی تھی......مسکراتی......

کیا میں اتنی حسین ہوں......یا یہ جھوٹ تھا؟ تم نے بھی تو مجھے دیکھا ہے......؟ چھوڑو تم مت بتاؤ مجھے......وہ عام انسان مجھے پل میں حور بنا جاتا تھا......تم تو پھر کہانی کار ہو......آگے لکھو۔

خود کو سچ میں دنیا کی حسین ترین لڑکی سمجھنے لگی تھی......مسکراتی تھی، قہقہے لگاتی تھی...... اس نے میرا حسن ہی مجھے نہیں دکھایا۔ پوری دنیا دکھا دی تھی......وہ دنیا عمر کے جس حصے میں میرے لیے بالکل اندھیرے میں ڈوب گئی تھی......اس وقت میں نے سب کچھ اتنے غور سے کہاں دیکھا

تھا۔ اس نے تمام لمحات کو تصویر کر کے دکھایا تھا...... ہم روز ملتے تھے...... گھنٹوں باتیں کرتے تھے...... وہ کہتا تھا کہ وہ تنہا ہے......اس دنیا میں بالکل تنہا ہے...... یہ تنہائی بھی ایسے ہی ہے جیسے نابینا ہونا...... اردگرد جب کچھ نہ ہو تو پھر ان آنکھوں کا کیا کرنا......؟ اور پھر وہ مجھ سے بھی اکثر پوچھا کرتا کہ میں کیا محسوس کر رہی ہوں...... میں بتاتی تھی......کبھی کبھی تو کہتا تھا کہ 'لو روشنی...... میں نے بھی آنکھیں میچ لی ہیں......اور آؤ ایک طرح کی نظر کے ساتھ دنیا دیکھتے ہیں۔ ایک جیسی دنیا......' اور پھر پوچھتا:

کیا وہ سچ میں آنکھیں بند کرتا ہوگا؟ ہاں شاید کرتا ہوگا...... یا شاید نہیں......تم مت رکو...... لکھتے رہو۔

اور پھر پوچھتا تھا کہ تم نے کیا دیکھا...... میں ایک خوبصورت جھوٹ بول دیا کرتی تھی کہ تمہارا چہرہ...... چہرہ تو دیکھتی تھی......لیکن یہ سچ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ اسی کا چہرہ ہی ہوتا ہوگا...... وہ دن بہت خوبصورت تھے......میں دل و جان سے اپنا سب کچھ اس کو سونپنے کے لیے تیار تھی۔

ایک دن اس نے مجھے اپنے اپارٹمنٹ پر ساتھ چلنے کے لیے کہا...... میں بہت ڈر تو رہی تھی......لیکن مجھے اس لمحے یہ بھی محسوس ہوا کہ شاید یہ میری دبی سی خواہش آج پوری ہونے جا رہی ہے۔

میری ایک ٹیچر تھیں، وہ بھی نابینا تھیں......لیکن میں انھیں دنیا کی سب سے زیادہ خوش قسمت لڑکی سمجھتی ہوں......وہ اس لیے کہ انہیں کسی آنکھوں والے کے ساتھ محبت ہوگئی۔ اور اس آنکھوں والے کو ٹیچر کے ساتھ...... دونوں نے شادی بھی کر لی......اور پھر ٹیچر کی آواز میں کبھی اداسی محسوس نہیں ہوئی تھی...... وہ پہلے سے زیادہ کھِل سی گئی تھیں......انہیں بہت محبت ملی...... پتہ ہے؟ ٹیچر نے ایک دن مجھے بتایا تھا کہ ان کا شوہر ان سے اتنی محبت کرتا ہے کہ وہ اکثر کہتا ہے...... کاش ایسا ممکن ہوتا کہ میری آنکھیں تمہارے لیے کارآمد ہوتیں......تو میں تمہیں دے دیتا۔ باقی زندگی تم مجھے دنیا دکھاتیں......ٹیچر ناراض ہو جایا کرتیں تو کہتا کہ اچھا بابا...... چلو ایک آنکھ خود رکھ لیتا اور دوسری تمھیں دے دیتا...... دونوں مل کر دنیا دیکھتے۔

افسوس...... وہ ٹیچر زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہیں۔ لیکن مجھے ان کی موت کا افسوس ہے۔ دکھ نہیں...... دکھ اس لیے نہیں کہ زندگی اندھیروں میں ہو...... چاہے روشنی میں ......کم ہو یا

زیادہ......لیکن ہوخوبصورت......اتنی خوبصورت اور محبت سے بھری کہ جتنی اس ٹیچر کی تھی۔

میری کہانی کہاں تک پہنچی تھی......؟ہاں ہاں......تو لکھو آ گے۔

کہتے ہیں نا کہ یقین ڈر کو کھا جاتا ہے......اور میرا بھی یقین میرے ڈر کو کھا گیا......میں اس کے ساتھ چلی گئی تھی۔نجانے کن کن راستوں سے گزر کر اس کا گھر آیا تھا۔دل زور زور سے دھڑک رہا تھا......اور خیال میرے ڈوپٹے کی طرح پھڑ پھڑا رہے تھے......اس روز میں نابینا ہی نہیں تھی بلکہ سماعت بھی کھو چکی تھی......لوگوں کا شور......گاڑیوں کی آوازیں......سب کچھ کسی الگ دنیا میں رہ گیا تھا...... میں تھی......میرا تیزی کے ساتھ دھڑکتا دل تھا......اور ہر سمت خیالات کا ہجوم...... پتہ بھی نہ چلا کہ ہم اپارٹمنٹ پر پہنچ چکے تھے۔

میں نے اپنے ڈوپٹے اور حواس کو سنبھالا اور اس کا ہاتھ تھامے اندر داخل ہو گئی...... جہاں گھر کی سی خوشبو تھی...... بالکل گھر جیسی...... جہاں لوگ رہتے ہیں...... جہاں ان کے لیے کھانے پکتے ہیں...... جہاں ان کے جسموں کی مختلف بوئیں آپس میں مل کر ایک سی ہو جاتی ہیں...... جہاں کپڑوں کی مہک الگ ہوتی ہے......کھڑکیوں پر لٹکتے پردوں کی الگ خوشبو ہوتی ہے...... جہاں لکڑی کے فرنیچر کی بو ہوتی ہے...... جہاں...... جہاں کاغذی......مصنوعی پھولوں کی نہ بو ہوتی ہے......نا خوشبو......ایسے ہی گھر میں خوشبو تھی...... میں نے اس گھر میں قدم رکھتے ہی محسوس کی تھی۔

پھر میں اس کا ہاتھ تھامے ایک الگ جگہ داخل ہوئی......شاید اس کا بیڈ روم تھا...... بالکل خاموش سا تھا...... جہاں گھڑی کی 'ٹک......ٹک......ٹک......' بالکل واضح سنائی دے رہی تھی اور......اور وہ خوشبو......

اوہ خدایا...... میں نے بے چین ہو کر اس سے پوچھا تھا کہ کیا......کیا یہ تمہارا بیڈ روم ہے......؟اس نے میرا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر میرے ہونٹوں کو چومتے ہوئے جواب دیا تھا......ہاں...... یہ میرا بیڈ روم ہے......اور پھر اس پل نجانے کیوں مجھے اپنی اندھیری دنیا مزید اندھیری محسوس ہونے لگی تھی......نجانے کیوں اس کے ہونٹوں کا ویسا لمس نہ رہا تھا جو پہلی بار مجھے اس کے ہاتھ سے محسوس ہوا تھا...... اسی پہلے دن والا لمس...... جب میری اندھیری دنیا میں پھلجھڑیاں جلنے لگی تھیں......نجانے پھر پورے جسم میں گرمی کیوں نہ دوڑی تھی......نجانے

کیوں......؟

شاید اس لیے کہ اس کے بیڈ روم کی خوشبو میرے یقین کے پرخچے اڑا گئی تھی......

شاید......شاید......اس نے مجھے بہت زیادہ نابینا سمجھ لیا تھا......شاید اس کا خیال تھا کہ سب کچھ آنکھوں کے ساتھ دیکھ کر ہی محسوس کیا جا سکتا ہے......ہوسکتا ہے وہ نہیں جانتا تھا کہ جو آنکھیں نہیں رکھتے، جو اندھیروں کے عادی ہوتے ہیں...... جو اندھیروں سے دوستی کر لیتے ہیں......وہ اس روشن دنیا کے بھید کچھ زیادہ اچھی طرح جان سکتے ہیں......دھوکے تو نظر والے کھاتے ہیں۔

''خاموش کیوں ہو گئے تم......؟ آگے بھی تو پڑھو۔''

''نہیں روشنی......آگے کچھ نہیں لکھا......شاید کہانی یہاں آ کر مکمل ہو جاتی ہے۔''

مختصر مختصر

بریکنگ نیوز

ریموٹ کنٹرول کا بٹن دبتے ہی ٹی وی میں سے آواز آئی؛

''اجتماعی زیادتی کا نشانہ بننے والی اٹھارہ سالہ لڑکی نے انصاف نہ ملنے پر مقامی تھانے کے سامنے خود کو آگ لگالی۔''

عبداللہ کا ہاتھ جس میں نوالہ تھا، منہ کی طرف جاتے جاتے ایک بالشت پرے ہی رک گیا، نظریں سکرین پر چلنے والی سلائیڈ پر تھیں، دھیمی سی آواز اس کے منہ سے نکلی؛

''پیٹرول کی قیمتوں میں پانچ روپے کا اضافہ......؟ بین چو......کیا بنے کا اس ملک کا......؟''

شرمندہ سوال

''خدا تو پتھر میں بھی کیڑے کو رزق دے دیتا ہے، ہر حال میں اس کا شکر ادا کرتے رہو......''

فرزند علی نے مولوی جی کی بات بہت غور سے سننے کے بعد اپنی کمزور آواز میں سوال کیا؛

''مولوی جی بوڑھا ہوں کام تو مجھ سے ہوتا نہیں مگر نمازیں پوری پڑھتا ہوں، دن اور رات میں سے زیادہ وقت عبادت کرنے میں گزار دیتا ہوں۔ لیکن میرے یتیم پوتے پوتیاں میرے ساتھ فاقے کاٹ رہے ہیں۔ کیا خدا کو اپنے عبادت گزار پر اتنا بھی ترس نہیں آتا کہ وہ زیادہ نہیں تو کم ہی دے دے......؟''

''فرزند علی......خدا کے بارے میں اس طرح بات نہیں کرتے۔'' مولوی صاحب کی آواز میں گرج تھی۔

''مگر مولوی صاحب......''

''بس......جاؤ عبادت کے ساتھ محنت بھی کرو۔ خدا انہی کی مدد کرتا ہے، جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔ یاد رکھو، خدا محنت کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

فرزند علی سر جھکائے اپنا پھٹا جوتا پہن کر مسجد سے باہر نکلا، اور کچھ ہی دیر میں پلٹ آیا۔

''تم پھر آ گئے؟''

''مولوی جی، ایک اور بات......''

''ہاں کہو......''

''خدا تو انہی کی مدد کرتا ہے، جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں...... جو محنت کرتے ہیں......
لیکن آپ......''

''کیا میں......؟'' مولوی جی کی بھوئیں سکڑ گئیں...... ''ہاں بولو فرزند علی کیا میں......؟''

فرزند علی سر جھکا کر اپنے کانپتے ہاتھ سے کان کی لو، جو قدرے لال ہو گئی تھی مسلنے
لگا...... ''وہ............آپ...... ''

''کیا آپ آپ......؟''

''وہ...... کچھ نہیں جی...... آپ کا شکریہ......''

فرزند علی کے سر میں سوئیاں چبھنے لگی تھیں...... ماتھے کی جلد پر ننھے ننھے پانی کے قطرے
ابھر آئے تھے۔

دہشت

انعام اللہ خان اپنی ماں کے جنازے پر پاگل ہوگیا تھا۔اسی دن سے وہ تیز تیز چلتا جاتا
اورصرف دوالفاظ ہی باآواز بلند کہتا

''کلمہءشہادت''

سارادن گلیوں میں پھرتا رہتا۔داڑھی بڑھ گئی،شلوار پہلے سے ہی اونچی باندھتا تھا۔

ایک دن یونہی باآواز بلند''کلمہءشہادت'' کہتے کہتے بہت دور نکل گیا۔شہر سے باہر
فوجیوں کی چوکی تھی۔ گیٹ کیپر کرسی پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ اس کے کانوں میں آواز پڑی
''کلمۂ شہادت'' گیٹ کیپر کی آنکھ کھلی تو سامنے سے انعام اللہ خان کوآتے ہوئے دیکھا......

تڑ تڑ تڑ کی آواز آئی...... چوکی میں سے فوجی بھاگتے ہوئے باہر نکلے تو گیٹ کیپر
چلایا......

''پاس مت جانا......حرامزادہ خودکش بمبار ہے۔''

ایمان

میرے کمرے کی کھڑکی جو گلی میں کھلتی ہے کے باہر، دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر علاقے کے چند آوارہ لڑکے مقامی ویشیا کا ذکر کر کے لطف اندوز ہو رہے تھے، اور میں اپنے کمرے میں بیٹھا مدھم موسیقی کے ساتھ ساتھ ان کی واہیات باتیں بھی سن رہا تھا۔

اُن میں سے ایک نے کہا ''یار وہ اب بوڑھی ہوگئی، اس کی بیٹی دیکھی ہے، گلناز نام ہے۔ مادر چو...... بہت ظالم چیز ہے''

اس کی بات ابھی ادھوری ہی تھی کے اتنے میں اذان گونجنے لگی، اور اس شور میں ان کا ایک ساتھی یہ بات ٹھیک طرح سن نہ پایا تو میری کھڑکی بجا کر غصّے سے بولا۔

''یار گانے بند کرو، اذان ہو رہی ہے......''

ہنگامہ

ایک دم شور سنائی دیا؛

''ارے روکو، پکڑو اسے......پکڑو پکڑو......''

میں نے گھبرا کر پیچھے دیکھا تو ایک آنکھ سے اندھا، بھیانک اور ناٹا سا آدمی کچھ اوراق اٹھا کر بھاگ رہا تھا اور اس کے پیچھے بہت سے لوگ شور مچاتے آ رہے تھے۔ میں تقریباً دس قدم کے فاصلے پر تھا، دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک آنکھ سے اندھا، بھیانک اور ناٹا سا آدمی مجھ سے ٹکرایا اور ہم دونوں زمین پر گر گئے۔ میرے اٹھنے سے پہلے ہی وہ اٹھا اور اوراق چھوڑ کر بھاگ گیا۔

کچھ لوگ جو اس کے پیچھے بھاگے آ رہے تھے انہوں نے بکھرے ہوئے اوراق اکٹھا کرنا شروع کر دیے۔

میں نے اٹھ کر اپنے کپڑے جھاڑتے جھاڑتے پوچھا ''کیا ہے یہ؟''

سب اوراق چننے میں مصروف تھے، کسی نے جواب نہ دیا، ہر کسی کے ہاتھ جتنے آئے، اٹھا لیے۔ ان میں سے ایک میں نے محض دیکھنے کی خاطر اٹھایا، شاید پہلا ورق تھا...... بڑا بڑا لکھا ہوا تھا؛

''تاریخ''

اذان

میرے دروازے پر دستک ہوئی، میں نے دروازہ کھولا تو باہر چھے سے سات سال کے تین بچے کھڑے تھے۔

''سر جی کوڑا''

''آ جاؤ اٹھالو''

تینوں بچے کوڑے والی ٹوکری کی طرف بھاگے، ان میں سے ایک جو بغیر قمیض کے تھا اور گلے میں صلیب پہنی ہوئی تھی جیت گیا، اس نے ٹوکری اٹھا کر کوڑا گلی میں کھڑی اپنی گدھا گاڑی پر پھینک دیا، اس کے بعد تینوں ہی ایک دوسرے کو پیچھے دھکیلتے ہوئے بولنے لگے

''پیسے مینو دینا سر جی''

''نئیں نئیں......مینو دینا''

''کیوں کیوں؟ کوڑا میں چکیا سی، پیسے مینو دینا سر''

میرے ہاتھ میں جو دس کا نوٹ تھا ٹوکری اٹھانے والے بچے کو دیا تو وہ تینوں باہر نکل گئے اور میں کنڈی لگا کر اپنے کمرے کی کھڑکی کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

ابھی تک ان کے لڑنے اور ان میں سے ایک کے رونے کی آوازیں سن رہا ہوں۔

شکر ہے! اب ان کی آواز سنائی نہیں دے رہی، اذان ہو رہی ہے۔

تاثرات

قُربِ عباس کے افسانے پڑھنے کے بعد میں اپنے فہم کی پوری صداقت کے ساتھ اس امید کا اظہار کرسکتی ہوں کہ اردو ادب کے افسانہ نگر میں مستقبل کا ایک بڑا افسانہ نگار داخل ہو رہا ہے۔ اُس نے اس چھوٹی عمر میں جتنے اعتماد اور جرأت کے ساتھ ہمارے معاشرے کی سوچ اور رویوں کے تاریک منافقانہ چہرے بے نقاب کیے ہیں، جتنے سلیقے اور خلاقانہ مہارت سے زمین اور نچلی پرتوں کی پامال انسانیت سے جڑی کہانیوں کو افسانہ بنایا ہے، اسے دیکھ کر ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر اردو میں لکھے گئے اچھے افسانوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ اُس کی سوچ میں انکار اور احتجاج کی لے تیز اور پرزور ہے، اس کے ہاں حساس ذہنوں کو جھنجھوڑنے اور مردہ سوچ کو جگانے والے سوالوں کی گونج دار صدائیں سنائی دیتی ہیں۔ سلونی، ٹیکسیاں، پھانسی اور یا بارگاہِ خداوند جیسے افسانے پڑھنے کے بعد اس ذہین قلم کار سے میری بہت سی توقعات وابستہ ہیں۔

ڈاکٹر کوثر جمال، سڈنی، آسٹریلیا

قُربِ عباس کے افسانوں میں حقیقی زندگی کے عکس بھی ہیں اور رنگ بھی - وہ ہنساتا بھی ہے رلاتا بھی ہے......اپنے ساتھ ہر گلی کوچوں میں لیے، پھرتا ہے، یہ کہتے ہوئے کہ ''یہ زندگی دیکھو ،اس دکھ کو محسوس کرو، یہ آہیں ہیں، وہ چیخیں ہیں، یہ مظلوم ہے وہ ظالم ہے، سنائی دیتا ہے کچھ...... دکھائی دیتا ہے کچھ......؟''

ڈاکٹر افشاں ملک، انڈیا

قُرب عباس کی افسانوی کائنات تصوراتی نہیں، حقیقت اور سچائی کی ترجمان ہے لیکن حقیقت کو صرف جان لینا کافی نہیں، اسے ادب اور آرٹ میں بدلنے کا سلیقہ آنا اس سے بھی زیادہ

اہم ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ قرب عباس کے قلم کو یہ سلیقہ میسر ہے اور یقین ہے کہ جلدی ہی اس کا نامِ باوقار نامدار افسانہ نگاروں کی فہرست میں نظر آئے گا۔

نسیم سیّد، کینیڈا

قُربِ عباس کے افسانوں کی کتاب میرے پاس تبصرے کے لئے آئی تھی۔ اگر میں قُربِ عباس کو ذاتی طور پر نہ جانتا ہوتا اور کوئی یہ کتاب میرے ہاتھ میں تھما دیتا تو میرا پہلا تاثر اس کی عمر کے بارے میں یہی ہوتا کہ یہ اگر بوڑھے نہیں تو ادھیڑ عمر شخص کے مشاہدات اور مطالعے کا نچوڑ ہے۔ اُس عباس نے جوانی میں جو افسانے لکھے، وہ ہم اپنی ادھیڑ عمر تک بھی نہیں لکھ پائے تھے۔ قرب کے کردار ہوائی یا آسمانی نہیں، اسی دنیا کے باسی ہیں اور ہر روز میری اور آپ کی ان سے ملاقات ہوتی ہے لیکن ہمارے پاس چونکہ اُس جیسا مشاہدہ نہیں، اِس لیے ہم اُسے سرسری لیتے ہیں۔ کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ ان افسانوں کو پڑھنے کے بعد آپ مجھ سے یقیناً اتفاق کریں گے۔

اقبال حسن خان، اسلام آباد

قُربِ عباس اپنے فن میں ناگزیریت کا قائل ہے، اس کے ہاں جزئیات نگاری غیر ضروری کہیں نہیں ملتی۔ سلونی کی زنجیر اتنی ہی سخت ہے جتنی پلاٹ کی ڈیمانڈ ہے۔ جویریہ کا تکیہ لے کر سونا اور اپنے ادھورے پن کو مکمل کرنے کی کوشش کرنا، موسم، اوقات سفر اور کرداروں کی حرکات وسکنات کا افسانے میں فطری ہم آہنگی سے شامل ہونا ہی اچھے اور پختہ پلاٹ کی علامت ہے۔ زمان ومکاں سے جزئیات نگاری میل نہ کھائے تو غیر فطری محسوس ہوتی ہے۔ میرے اس دوست کے تصورِ افسانہ میں اتنی پختگی اور مہارت اس کے تصور زندگی کا عکس ہے۔ زندگی کے نیریٹوز کو سنجیدگی سے سمجھنے والے اپنے فن سے ایسی ہی وفاداری نبھاتے ہیں۔ امید ہے اس کتاب کے قارئین نہ صرف افسانوی متون سے زندگی کشید کریں گے بلکہ زندگی سے افسانہ بھی۔

فرخ ندیم، اسلام آباد

قُربِ عباس اپنے آپ سے سوال کرتا ہے، اپنے قاری سے مکالمہ کرتا ہے...... یہی وجہ ہے کہ وہ ان افسانوں میں اپنا دل چیر کر رکھ دیتا ہے۔ مجھے صرف اتنا کہنا ہے کہ اُس کے افسانے اپنے اسلوب میں ایک نمایاں جدت رکھتے ہیں۔ رواں بیانیہ اس کا خاصہ ہے۔ اس کے

کردار و مکالمے دکھ کی تمازت سے پگھل کر ایک نئی شکل میں سامنے آتے ہیں۔ بادی النظر میں یہ کہانیاں زندگی کی عام کہانیاں ہیں لیکن ان میں مخفی جدید فکر مقید ہے جو اپنے اظہار میں پختہ اور شستہ ہو جاتی ہے اور نئی انسانی فکر و عظمت کا یقین بن کر زندگی کی تحریک بن جاتی ہے۔

نعیم بیگ، لاہور

سلونی صرف ایک افسانوی مجموعہ نہیں ہے، یہ ہمارے گھٹن زدہ معاشرے میں ان کے لیے ایک نوید سحر ہے جو زندگی کو ایک نغمے کی طرح گا کر جینا چاہتے ہیں، جو زندگی کو اس کے فطری حسن کے ساتھ بسر کرنا چاہتے ہیں، جو زندگی میں ہر ذی روح کو اپنے وجود کا حصہ سمجھتے ہوئے آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔

سلونی وہ راستہ ہے جہاں انسان کے دکھ درد عریاں کھڑے محبت اور اپنایت کا لبادہ اوڑھنا چاہتے ہیں، جو زندگی کے ہر مسافر کو صرف اتنا کہتے ہیں کہ ہمارے پاس سے گزرتے ہوئے صرف ایک بار ہمیں دیکھ لو، پھر کبھی منہ نہیں موڑو گے۔

سلونی وہ بارش ہے جس کے ہر قطرے سے شعور کی اجڑی کھیتیاں ہری ہو جائیں گی۔
سلونی وہ ساز ہے جو مردہ ضمیروں کو بیدار کرے گا۔ سلونی ہوا کا وہ جھونکا ہے جو صدیوں سے سیلن زدہ معاشرتی گھٹن میں سانسوں کو فرحت بخشے گا۔

زبیر سیاف

لاہور

ایڈمن، عالمی افسانہ فورم

ایگزیکٹو ڈائریکٹر، جہاں ساز فاؤنڈیشن

اِس سے بڑا ظلم اور کیا ہوسکتا ہے کہ حَسیں
خواب...... بے شکل روایات کی بھینٹ
چڑھا دیے جائیں......